U19712 P 271-10

-- MARD-E-MOMIN.

Author - Meer Wali Nadvi.

Publisher - Kitab Manzil (Lahore).

Date -

Pages - 212.

Subject -

سلسلۂ مطبوعات نمبر ۵

ڈاکٹر میر ولی الدین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

انتساب

میں اپنی اس پیشکش کو مولائی و آقائی حضرت محمد حسین صاحب
قبلہ مرحوم و مغفور کے اسم گرامی پر جن کے فیضان توجہ و برکات
تربیت کا یہ براہِ راست نتیجہ ہے۔ جذباتِ تشکر و امتنان کے ساتھ
معنون کرتا ہوں

عمر حریص در طلب کیمیا گزشت　　　ما را قبول اہلِ نظر کیمیا بس است

میر ولی الدین
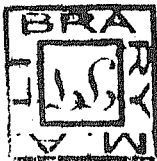
عرضِ ناشر

ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب کسی تعارف کے محتاج نہیں صاحب موصوف مذہب اور دینداری کے زندہ پیکر ہیں۔ اور اُن کی فیضِ صحبت سے ان کے بیسیوں طالب علم صبغۃ اللہ میں رنگے جا رہے ہیں رات دن کے اس مشغلہ سے ان کو انسانی کردار کی تعمیر کا ایسا ملکہ حاصل ہو گیا ہے کہ وہ اس کی نفسیاتی کمزوریوں اور امراض کی تشخیص کر کے قرآن کے ذریعہ ان کے بہترین علاج تجویز فرماتے ہیں۔ مزید برآں اپنے مقالات میں جابجا احادیث اور صوفیائے محققین کے اقوالِ نظم و نثر سے بکثرت استشہاد فرماتے ہیں اور باوجودیکہ ڈاکٹر صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی (لندن) بار ایٹ لا اور جامعہ عثمانیہ میں مغربی فلسفہ کے صدرِ شعبہ وغیرہ سب کچھ ہیں۔ لیکن مقالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ تصوف قرآنی کے کسی رمز شناس عارف کے قلم سے یہ سطور نکلی ہیں

بہرحال یہ کتاب فلسفہ، تصوّف اور ادب کا ایک خوشگوار امتزاج ہے۔ ان مقالات کے متعلق وقتاً فوقتاً ہندوستان کے مؤقر رسائل نے جو نقد و تبصرہ کیا ہے وہ اہل علم حضرات سے پوشیدہ نہیں۔

غیر منقسم ہندوستان میں یہ مجموعہ "قرآن اور سیرت سازی" کے نام سے محدود تعداد میں طبع ہوا تھا۔ لیکن اب پاکستان کی نئی ضروریات و مقتضیات کے پیش نظر یہ مجموعہ "مرد مومن" کے نام سے پیش کیا جا رہا ہے۔

فہرست عنوانات
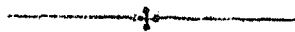
تمہید

پیشِ نظر کتاب بظاہر ایک کثرت ہے اور یہ کثرت مختلف موضوع کے اظہار خیالات پر مشتمل ہے۔ مختلف اوقات میں مختلف تصورات کو واحد نصب العین کے زیر اثر پیش کیا گیا تھا اور اب انہیں یک جا حاضر کر دیا گیا ہے لیکن نصب العین کی غیبت ہی وہ وحدت ہے جو اس کثرت میں متجلی ہے اور انہیں ایک شیرازہ میں باندھ رکھا ہے۔ اس نصب العین کو یہاں مختصراً پیش کرنا مقصود ہے

عہد حاضر کے نوجوانوں کا خیال ہے کہ دین معاملہ ہے ان چند ناکامیاب، افسردہ دل، آشفتہ دماغ ضعیفوں کا جن کے ہاتھ سے دنیا نکل چکی ہے، جن میں متاعِ دنیوی سے محفوظ ہونے کی نہ قابلیت باقی رہی ہے اور نہ خواہش، یہ مسرت و شادمانی کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ چکے ہیں، اور حزن و غم کے آغوش میں ان کے دن گزر رہے ہیں۔ دنیا میں کامیابی، کامرانی، مسرت و راحت کا حاصل کرنا دنیوی اصول کے عاقلانہ استعمال ہی سے ممکن ہے۔ دینی اصول کو ان میں کیا دخل ہے۔ شاید قبر کے اس طرف اُن کا کام پڑتا ہو تو ہو!

پیشِ نظر اوراق میں اس مغالطہ کو اس کی تمام تفصیلات میں رفع

(۱) کرنے کی کوشش کی گئی ہے اصولاً بتلایا گیا ہے (کہ کامیاب زندگی بسر کرنے کے لئے سیرت کی تعمیر ضروری ہے اور جب تک سیرت کی تعمیر قرآنی اصول پر نہ ہو دنیا میں کامیابی و کامرانی کے ساتھ چین و طمانیت کا جمع ہونا ممکن نہیں کامیابی محض مال یابی کا نام نہیں، بلکہ مراد ہے طمانیتِ روح اور بے دلی کا جو محض مالیات کو کسی طرح حاصل نہیں ہوتی۔ واضح کیا گیا ہے کہ دنیوی عقل میں روشنی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ حرص و ہویٰ سے آزاد ہو کر علمِ وحی کے تابع ہو جاتی ہے) اور حقیقت میں عاقل و بالغ وہی ہے جو ہویٰ و ہوس سے آزاد ہے۔

خلق اطفال اند جز مستِ خدا ... نیست بالغ جز رہیدہ از ہویٰ

(رومیؒ)

(۱) (کامیابی و کامرانی، مسرت و طمانیت اس مردِ حر کا انعام ہے جس نے اپنی عقل کو محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل پر قربان کر کے اپنی ذات میں تقویٰ کے اوصاف پیدا کر لئے ہیں اور حق تعالیٰ کو مہمات دینی و دنیوی میں کافی تصور کیا ہے۔)

اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ۔

عقل قربان کن بہ پیشِ مصطفیٰ ... حسبی اللہ گو کہ اللہ ام کفیٰ

زیں خرد جاہل ہمی باید شدن ... دست در دیوانگی باید زدن

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نشد ... ایں عسس را دید و در خانہ نشد

(رومیؒ)

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین نے اسی طریقہ سے تسخیرِ جہات میں
کامیابی حاصل کی تھی۔ ان کے شکوہ و جلال سے سلاطین کانپ اٹھتے تھے۔ انہوں
نے حریت و آزادی کا تسلط دنیا میں قائم کر دیا اور جبر و استبداد کا خاتمہ
کر دیا تھا۔ اسی اسوہ پر ایک بار پھر زندگی کو مرتب کرنے کی ضرورت ہے
اور ان اوراق کا مقصد عہدِ حاضر کے نوجوانوں کو اس کی طرف دعوت دینا
اور اس کی تفصیلات کو ان پر واضح کرنا ہے۔

خود مؤلف کو اس اسوہ کی طرف کچھ سال قبل ایک عارفِ تام المعرفت[1] نے
بلایا اور اپنی زبانِ فیض ترجمان سے اس کی تفصیلات کو سمجھایا اور سات سال
کے دوران میں مختلف اوقات میں ہر جزوی کی کلی وضاحت فرماتے رہے۔
مغربی و مشرقی فلسفہ کے گہرے مطالعہ سے جس دماغ نے تربیت پائی تھی، اور
جس کی عقل کو بقول اقبال "تنقید سے فرصت نہ تھی"، اور جو بالآخر عقل کی گتھیوں
کو سلجھانے سے عاجز آ گیا تھا اس "صاحبِ جنون" نے اپنے ایک نکتہ سے کہ
عقل تابعِ وحی ہو کر ہی اپنے جنون سے نجات پا سکتی ہے، لات و منات کی
بندگی سے آزاد ہو سکتی ہے اس کو "دلِ بینا، سندو نگاہِ پاک باز" کا
شیدا کر دیا جو حصولِ معرفت کا واحد طریقہ ہے۔ اس نکتہ کے قلب میں اترنے
کے بعد ہی صاحب کی اقبال نے خبر دی تھی۔

---

[1] میرا اشارہ ہے مولائی و آقائی حضرت محمد حسین صاحب قبلہ کی طرف ہے جو ۲۲ ربیع الاول ۱۳۴۶ھ کو مجھے اپنے فراق میں مجروح چھوڑ کر رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے قدس سرہ در جنان جنت نعیم۔

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود　　　جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود

اس روحانی انقلاب کے بعد جہاں جیسا نظر آنے لگا اس کو ان صفحات میں پیش کیا گیا ہے۔ اولاً اصولِ موضوعہ کو پیش کیا گیا ہے، ان کو اپنی ہمت اور اختیار کے استعمال سے عمل میں لانے کی تاکید کی گئی ہے، پھر ان ہی اصول کو مختلف مسائل کے حل کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ سیرت سازی کے لیے خوف و حزن و غضب کے دفعیہ کے لیے، کامیاب زندگی کے لیے، اطمانیت و برد قلبی کے حصول کے لیے۔ ان نسخوں میں سے اکثر کو معارف کے صفحات میں پیش کیا گیا اور اہلِ ملک نے اس کو پسند بھی فرمایا ہے یہاں یہ سب یکجا حاضر ہیں۔ یہ اس دل کا سوغات ہیں جو عقل کا غلام نہیں۔

صبح ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے　　　جو عقل کا غلام ہے وہ دل نہ کر قبول

(اقبالؒ)

مگر زبان عقل کی ہے، تصورات و تعقلات سب عقلی ہی ہوتے ہیں اور انھی میں مفہومات روحانی کو پیش کیا جا سکتا ہے، لہذا مقصود مفہوم ہے نہ کہ زبان جو محض ذریعہ ہے۔ والسّلام علی من اتبع الھدٰی۔

۲۷۔ مارچ سنہ ۱۹۲۵ء

(میر ولی الدین)

اُصولِ موضُوعہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

عبادت و استعانت

اے درد دل من اصل تمنا همه تو — وی درد سر من مایۂ سودا همه تو
هر چند به روزگار در می نگرم — امروز همه تویی و فردا همه تو

(ابو سعید مہنہ)

انسان بلکہ تمام حیوانات کی زندگی کا پہلا قانون جلب منفعت و دفع
مضرت ہے، تحفظ ذات اور تولید نسل دونوں کے لئے ضروری ہے تاکہ یہ
ان چیزوں کی طلب کرے جو اس کی زندگی کے حفظ و بقا میں ممد و معاون
ہیں، اور ان چیزوں سے گریز کرے جو اس کو عدم کی طرف لے جاتی ہیں،
یا قوت حیات کی تحدید کا باعث ہوتی ہیں۔ اشیاء کی ابتدائی تقسیم اسی نقطۂ
نظر سے کی جاتی ہے۔ اشیاء یا تو نافع ہیں یا ضار، مفید ہیں یا نقصان رساں،
اچھی ہیں یا بری۔ اعضویت پر جب ان کے اثرات کا ترتب ہوتا ہے تو لذت،
محبت، فریفتگی یا اطاعت پیدا ہوتی ہے، یا الم، نفرت، خوف اور توحش،
ان میں سے ایک بالطبع محبوب ہے۔ مرغوب ہے، تو دوسری فطرۃً غیر محبوب
و نامرغوب۔ ایک کے حصول کا وہ کوشاں ہوتا ہے، تو دوسرے سے گریزاں

کوشاں ہو کہ گریزاں انسان کی زندگی کا تار و پود یہی جذبات ہیں، ان کا زور برداشت نہیں ہوتا ہے۔ ان کے شر و شور سے اس کو فرصت ملتی ہے اور نہ نجات یہاں تک کہ زندگی کے مقررہ دن ختم ہو جاتے ہیں، اور وہ یہ کہتا ہوا رخصت ہوتا ہے۔

من باغ جہاں را تفسے دیدم و بس   سرغش نہ ہوا و ہوسے دیدم و بس
از صبح وجود تا شباں گاہِ عدم   چوں چشم کشودم نفسے دیدم و بس

(سحابی استر آبادی)

اپنی زندگی کے مختصر قیام میں ہر شخص اشیاء کی تغیّر و حدوث کا اچھا مشاہدہ کرتا ہے، کائنات میں ایک دائمی تغیّر جاری ہے، کوئی شئے ساکن نظر نہیں آتی سکون و ثبات فریب نظر معلوم ہوتے ہیں۔ ہر ذرّہ کائنات میں ایک تڑپ سی نظر آتی ہے، کاروانِ وجود کو کہیں قیام نہیں، شانِ وجود ہر لحظہ تازہ ہوتی ہے، قہری تجلّی ہر شئے کو ہر لحظہ فنا کر رہی ہے، اور جمالی تجلّی ہر لحظہ وجود بخش رہی ہے ؎

ہستی کہ عیاں نیست در آں در شانے   در شانِ دگر جلوہ کند ہر آنے
ایں نکتہ بجو ز کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَاْنٍ   گر بایدت از کلام حق برہانے

(جامیؒ)

اشیاء کے اس تغیّر و تبدّل، تلوّن و حدوث و فنا پذیری و زوال کی کیفیت جب چشم بصیرت رکھنے والے انسان پر نمایاں ہو جاتی ہے، تو اپنا اپنے فقرہ

احتیاج کی وجہ سے ذل و انکسار یا بندگی کی نسبت جو ان سے قائم کر رکھی تھی وہ یکدم کٹ جاتی ہے۔ ذواتِ خلق[1] کا فقر اس کی نظروں میں واضح ہو جاتا ہے۔ اور اس کو اس ذات کی تلاش و جستجو ہوتی ہے، جو حدوث و تغیر سے منزہ ہے جو قائم بالذات و مقصود بالذات ہے، جو واجب و قدیم ہے صفاتِ کمالیہ سے موصوف ہے، فعال ہے، سارے جہان کی مالک و حاکم و مولیٰ و رب ہے۔

اب مذہب یا دین کا ماحصل بھی اتنا ہی ہے کہ ذل و افتقار کی نسبت (جس کو دین کی زبان میں عبادت و استعانت سے تعبیر کیا جاتا ہے) ذواتِ خلق سے قائم نہ کی جائے، اور احتیاجات اور مرادات میں استعانت ذواتِ خلق سے نہ کی جائے، بلکہ عبادت و استعانت کا مرکز ذات اللہ رہے، یہی مفہوم ہے اس دعوتی کلمہ طیبہ،

لَآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ط

کا کہ اللہ کے سوا کوئی ذات قابل عبادت و مستحق استعانت (الٰہ) نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، اس پیام کو ساری دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لئے بھیجے گئے ہیں۔

فقر و احتیاج انسان کی فطرت میں شامل ہے، اسی فقر یا احتیاج کو رفع کرنے کے لئے وہ ہر نفع و ضرر پہنچانے والی چیز کو اپنا "الٰہ" قرار دیتا ہے۔

---

[1] یعنی مخلوق۔

خواہ یہ چیز عناصر سے ہو، یا جمادات سے، نباتات سے ہو یا حیوانات سے، فوق الفطرت ہو یا فوق البشر، ان سے رفع احتیاج کے لیئے اعانت طلب کرتا ہے، اور استعانت کے لیئے ان سے ذل و افتقار کی نسبت قائم کرتا ہے۔ اپنے جہل اور نادانی کی وجہ سے ان کو مستقل طور پر نافع اور ضار خیال کرتا ہے، اور یہی خیال اسکو اپنے سے کمتر مخلوق کے آگے سجدہ ریز ہونے پر مجبور کرتا ہے۔

حواس کے اس التباس اور عقل کے اس دھوکے کو دُور کرنے کے لیئے دینِ حق کا یہ پیام محمد عربی (فداہ ابی و امی) نے عالم کو سنایا کہ انسان اشرف المخلوقات ہو کر فطرت کا شکار ہو کر اپنے سے ادنیٰ اور کمتر مخلوق کے آگے ذلیل نہیں ہو سکتا، اس کی گردن اگر جھک سکتی ہے، تو اسی ایک ہمہ خیر، ہمہ داں و ہمہ بیں و ہمہ توان ہستی کے آگے جس کے دستِ قدرت میں ساری کائنات کی باگ ہے، جو جملہ صفات کمالیہ سے متصف ہے اور تمام عیوب سے منزّہ اور مبرّا ہے! یہی ہستی ہماری الٰہ ہے، یہی قابلِ عبادت ہے، یہی مستحقِ استعانت ہے، یہی ہماری خالق ہے، مالک ہے، ہماری ربّ ہے، مولیٰ ہے، حاکم ہے، اسی کے ہم مخلوق ہیں، مملوک ہیں، مربوب ہیں، عبد ہیں، محکوم ہیں، اسی کی ہم عبادت کرتے ہیں۔ اور اسی سے تمام حاجات و مرادات میں بھیک مانگتے ہیں، یہی ذات غنی ہے اور ہم سب اسی کے فقیر ہیں، اس کے فقیر ہو کر ہم سارے عالم سے غنی ہیں!

یہ پیام صدقِ محض ہے، ہماری عزتِ نفس کے عین مطابق ہے حق و

خلق کے رابطہ کا سچا اظہار ہے۔ اس کو مان کر انسان حقیقی معنی میں انسان بنتا ہے۔ بے خوف، بے جگر مجاہد جس کی امید و بیم کا مرکز وہی ایک اللہ ہے جو سارے عالم کا مالک اور حاکم ہے۔ اب مجاہد کی زندگی کی ہر جنبش اسی مالک و حاکم کے حکم کے تحت ہو جاتی ہے، اور اس کے احکام کی تعمیل میں، امر کے امتثال میں وہ ایک جان دیتا ہے، تو ہزار جان پاتا ہے، اس کا ضعف قوت سے اس کی ذلت عزت سے، اس کا فقر غنا سے بدل جاتا ہے، موجودات عالم میں سے وہ کسی سے نہیں ڈرتا فَلَا تَخَافُوهُمْ وَخَافُونِ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ[1] کا حکم اس کو سارے عالم سے بے خوف کر دیتا ہے، نہ وہ کسی سے امید و رجا رکھتا ہے۔ أَلَيْسَ اللَّهُ بِكَافٍ عَبْدَهُ[2] اس کو ساری کائنات سے غنی کر دیتا ہے۔ ذوات خلق سے امید و بیم کی نسبت کٹتے ہی وہ نفس مطمئنہ حاصل کر لیتا ہے۔ اور اپنے رب سے راضی ہو جاتا ہے۔ اللہ کو راضی رکھ کر وہ غیر اللہ سے مستغنی ہو جاتا ہے، اب وہ غنی عن الشئ ہے، کونسی چیز اللہ سے برتر ہو سکتی ہے، جس کے حصول کی وہ خواہش کرے اب سب کچھ اسے حاصل ہے۔ اس لئے فرمایا گیا ہے۔ لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ[3] علاوہ تمکین اسی کو حاصل ہے۔ وہی مخاطب ہے اس قول کا

---

[1] اگر تم مومن ہو تو ان سے خوف نہ کرو مجھ سے خوف کرو۔

[2] کیا اللہ بندے کے لئے کافی نہیں۔

[3] تاکہ تم غم نہ کھاؤ اس پر جو ہاتھ نہ آیا اور شیخی نہ کرو اس پر جو تم کو اس نے دیا۔

اَنتُمُ الاَعْلَوْنَ وَاللّٰہُ مَعَکُمْ[1]

دیکھو "الٰہ" کے فہم نے اِس کو کیا سے کیا کر دیا، ! یا تو وُہ ایک حقیر اور ذلیل جانور کی طرح ہر ایک سے ڈرتا اور لرزتا تھا، ہر ایک کو نافع اور ضار قرار دیتا تھا، سرِ عبودیت خم کرتا تھا، مدد و اعانت کا خواہاں تھا، ان ہی کی عبادت و عبودیت میں زندگی گزار رہا تھا، متوحش، پریشان، حیران، خود ضعیف اور مطلوب بھی ضعیف ضعف الطالب والمطلوب یا اب علمِ رسالت کے جاننے اور ماننے کے ساتھ ہی لا کی شمشیر ہاتھ میں لے کر وُہ آگے بڑھتا ہے اور اپنے جاہل ساتھیوں سے قرآن کے الفاظ میں پوچھتا ہے،

اَفغیر اللّٰہ تامرونی اعبد ایھا الجاھلون[2] ؟

تا چند گہ از چوب گہ از سنگ تراشی — بگذار خدائے کہ بصد رنگ تراشی

غیر اللّٰہ کی عبادت و عبودیت کا جوا وہ گردن سے نکال کر پھینک دیتا ہے عُمر میں پہلی مرتبہ حرّیت محسوس کرتا ہے، خوف کا بھاری پتّھر اس کے سینہ سے اٹھ جاتا ہے، اپنے حقیقی مولا کے آگے جھک جاتا ہے اور ان کو رحیم پاتا ہے کَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا کی بشارت اس کو ہر طرح مطمئن کر دیتی ہے۔ اب اس کو یقین ہو جاتا ہے کہ حق تعالےٰ اس کے ساتھ ایمان کے بعد شانِ رحمت ہی سے پیش آئیں گے، ان کے علاوہ رحیم ہونے کے حاکم و حکیم ہونا اس کے

---

[1] تم ہی بلند ہو اللّٰہ تمہارے ساتھ ہے۔

[2] اے جاہلو کیا تم مجھے غیر اللّٰہ کی عبادت کرنے کا امر کرتے ہو۔

دل کو اور قوی کر دیتا ہے، وہ انہیں اپنے ہر امر میں متصرف سمجھتا ہے اور ان کے ہر فعل کو سراسر حکمت سے مملو دیکھتا ہے، ان ہی کے حکم کے مطابق ان کو اپنے کاموں میں وکیل بناتا ہے فاتخذہ وکیلا۔ ان کا فرمان ہے کفیٰ باللہِ وَکِیْلًا۔ کہہ کر وہ آزادی و اطمینان کے ساتھ مصروفِ عمل ہو جاتا ہے۔! اب کہاں یہ اور کہاں وہ جاہل جو غیر اللہ سے ذل و افتقار کی نسبت جوڑ رہا ہے، سچ ہے۔

ومایستوی الاعمٰی والبصیر ولا الظلمات ولا النور ولا الظل ولا الحرور ومایستوی الاحیاء ولا الاموات[1] (الفاطر۱۵)

دین کا اجمال، عبادت و استعانت، اس کا ماحصل، تحفظِ توحید، اب اس اجمال کی کسی قدر تفصیل ضروری ہے۔

عبادت غایت تذلل کا نام ہے، جس کا اظہار معبود حقیقی کے آگے کیا جاتا ہے، اس کے معروف طریقے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ ہیں، نماز کے تمام اعمال و ارکان پر غور کرو، عبادت یا اظہار ذلت کا مفہوم بخوبی تمہارے دلنشیں ہوگا، عابد نماز کا قصد کر رہا ہے، اصلی کی طرف بڑھ رہا ہے، زبان پر ہے اِنّی ذاھب الی ربی سیھدین[2]۔ دل غیر حق سے پاک ہے، حق تعالیٰ کے سوا کسی کو بزرگی کا مستحق نہیں سمجھتا، اور اسی فہم کے ساتھ تکبیر تحریمہ اَللّٰہُ اَکْبَر

---

[1] برابر نہیں اندھا اور دیکھنا اور نہ اندھیرا اور نہ اجالا اور نہ سایہ اور نہ لو اور برابر نہیں جیتے اور نہ مرے

[2] میں اپنے رب کی طرف چلا ہوں وہ میری ہدایت کرے گا۔

کہتا ہے اور جب حق تعالےٰ کے روبرو ہو کر کہتا ہے۔ اِنی وجہت وَجہی للذی فطر السمٰوات و الارض حنیفا وما انا من المشرکین، بِل پوری طرح متوجہ بھی ہے، اور نہ جانتا ہے کہ جھوٹ کی سزا کیا ہے یخادعون اللہ وَ ھو خادعھم، اب نیت میں بھی خلوص ہے، حق تعالیٰ ہی کے لئے نماز پڑھ رہا ہے، عاشقانہ ایمان کے پیدا ہوتے کے لئے پڑھ رہا ہے، عادت کے تحت نہیں، انھی کے خوف وقت سے پڑھ رہا ہے، ثنا میں حق تعالیٰ کی عظمت وجلالت و جبروت کا اظہار کر رہا ہے، اور توحید کا اقرار لا الٰہ غیرک سے ہو رہا ہے، اب حضوری میں دست بستہ نظر نیچی کئے ذلت و مسکنت کی تصویر بنا کھڑا ہے، زبان پر جاری ہے۔ الحمد للہ اور دل میں سمجھ رہا ہے کہ عالم میں کوئی ذات مستحق حمد نہیں، سارے محامد و محاسن کی وہی ایک ذات لاشریک لہٗ سزاوار ہے جب رب العالمین کہتا ہے تو جانتا ہے کہ کا رب سوائے ربوبیت اسی کو زیبا ہے، عالم تمام اس کا مربوب ہے۔ الرحمٰن الرحیم کہتے وقت عالم رجامیں داخل ہوتا ہے، رحمت وکرم کی امید دل میں پیدا ہوتی ہے، جانتا ہے کہ رحمانیت کا تعلق تو ساری کائنات سے ہے رحیمیت خصوصی شئے ہے اور مومنین سے مختص کان بالمومنین رحیمًا مالک یوم الدین۔ کہتے وقت عالم خوف کا مشاہدہ کرتا ہے، روز قیامت حق ہے اور یہ وہ دن ہے کہ اس کی شان میں فرمایا گیا

ل‍ه دغا بازی کرتے ہیں اللہ سے اور وہ ہی اُن کا دغا دے گا۔

يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا[1]۔ اس امید و بیم کی حالت میں عرض کرتا ہے اِيَّاكَ نَعْبُدُ حق تعالےٰ ہم آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں۔ ذل و افتقار کا رشتہ آپ ہی سے جوڑتے ہیں۔ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ۔ آپ ہی سے استعانت کرتے ہیں، جانتے ہیں کہ لا فاعل فی الوجود الا اللہ ماسوی اللہ سے بالکلیہ اعراض کرکے آپ ہی کی طرف بالکلیہ رجوع ہوتے ہیں ہم آپ کے سوا استعانت کی جہت سے غیر کو کیوں پکاریں جب کہ ہمیں یہ سنا دیا گیا ہے اور ہم نے بھی تجربہ سے اس کی توثیق کر لی ہے کہ آپ کے سوا کسی میں حول و قوت نہیں لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ اس لئے کہ وہ ہمیں نفع پہنچا سکتے ہیں، نہ ضرر، اس مدح و ثنا و اقرار عبودیت کے بعد التماس و دعا اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ حق تعالےٰ راہ مستقیم کی ہدایت فرمائیے نفس و ہوا سے چھوٹیں آپ کا قرب نصیب ہو صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ۔ اہل انعام کی راہ پر چلنا نصیب ہوا جو انبیاء و اولیاء کی راہ ہے یہی اہل انعام ہیں۔ وَالَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ مِنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِيْنَ۔ مغضوبین و ضالین کی راہ نہیں جنہوں نے غیر اللہ سے عبادت و استعانت کا رشتہ قائم کرکے ہمیشہ کے خسارہ میں اپنے آپ کو مبتلا کر لیا۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ!

---

[1] جس دن نہ کر سکے کوئی نفس، کسی نفس کا کچھ۔

اس حمد و ثناء التماس و دُعا کے ساتھ وہ کلام ربانی کی چند اور آیتیں احکام خداوندی کے معلوم کرنے، تکرار سے ان کو اپنے ذہن میں جمانے، ہر حرف کی تلاوت پر دس نیکیاں کمانے اور حق تعالےٰ سے سرگوشی کرنے کے لئے پڑھتا ہے اور پھر وہ اپنی پیٹھ میں جھک جاتا ہے گویا اپنے رحمان و رحیم آقا کے "پیٹھ میں ہونڈی" دے دیتا ہے، اس طرح اپنی ذلت کا مزید اظہار کرتا ہے، اسی حالت میں اس کی زبان سے اس کے مولےٰ کی تقدیس و تنزیہ و تمجید جاری ہوتی ہے، اپنی بے مائیگی، فقر و ذلت کا احساس قلب میں واقعی طور پر موجود ہوتا ہے، جب سر اٹھاتا ہے تو حق تعالیٰ اسی کی زبان سے فرماتے ہیں سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ اسی طرح اس کا مرتبہ بلند کرتے ہیں، جو سر معبود حقیقی کے سامنے جھکتا ہے، وہ مخلوق کے آگے جھک نہیں سکتا، وہ سب سے بلند ہوتا ہے، ممتاز ہوتا ہے، بے نیاز ہوتا ہے، وہ ایک لاقیمت جوہر ہوتا ہے، سچ ہے،

مَنْ رکن الی المولیٰ و مال الیه احرقه اللّٰهُ بنوره حتیٰ یصیر جوهرًا لا قیمته له[1] (حدیث)

اس سرفرازی کے شکریہ میں وہ حق تعالےٰ کی حمد کرتا ہے، اور پیروں پر گر جاتا ہے، اور اس طرح غایتِ تذلل کا اظہار کرتا ہے، زبان پر آقا کی

---

[1] جو اپنے مولیٰ کیطرف جھکتا ہے اور اس کی طرف مائل ہوتا ہے، تو وہ اس کو اپنے نور سے جلا دیتا ہے، یہاں تک کہ وہ لاقیمت جوہر ہو جاتا ہے۔

عظمت و رفعت و علو کا اقرار جاری ہوتا ہے، اس اظہارِ تذلّل میں وہ اپنی آنکھ کی ٹھنڈک پاتا ہے۔ وَجُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِي فِي الصَّلٰوةِ[1]۔ آنکھ کی ٹھنڈک اس کو اپنے محبوب مولیٰ کے مشاہدے سے ہو رہی ہے، یہی اس کا کمال ہے، یہی اس کی معراج ہے۔ اَلصَّلٰوةُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

معبود کا نہ صرف خیرِ محض ہونا ضروری ہے، بلکہ اس کا ہمہ توان یا قادر مطلق ہونا بھی لازمی ہے، یہ اپنی لامحدود قوّت اور لامتناہی طاقت کی وجہ سے ہماری حفاظت کرتا ہے، ہماری حاجتوں کو پوری کرتا ہے۔ مرادوں کو بر لاتا ہے، اس کے اعتصام کے بعد ہمیں اس کی نصرت و اعانت کا قطعی یقین ہو جاتا ہے، شر کے مسئلہ کی توجیہ سے عاجز ہو کر ثنا یجیہ[2] نے خدا کے ہمہ توان ہونے کا انکار کر دیا، لیکن جو قادرِ مطلق نہ ہو، وہ معبودِ حقیقی کب بن سکتا ہے، جو خود شر پر غالب نہ ہو ہماری مدد کیسے کر سکتا ہے ہمارا مولیٰ اور نصیر کیسے ہو سکتا ہے، شر کی توجیہ کا یہ موقع نہیں، لیکن ہم اپنے معبود کو فعّالِ مطلق، ہمہ توان مانتے ہیں، افعال و آثار کا مرجع اسی کو قرار دیتے ہیں، حول و قوت کا اسی کو مبدأ سمجھتے ہیں، اسی لئے اس سے استعانت چاہتے ہیں اور اس کے نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ

---

[1] میری آنکھ کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے (نسائی باب عشرت النساء)

[2] زمانہ جدید کے فلسفیوں کا ایک گروہ جن میں ولیم جیمس، ایچ جی ولس، برناڈ شاہ وغیرہ شامل ہیں۔

ہونے کا یقین رکھتے ہیں اعتصموا باللہ ھو مولٰکم نعم المولٰی ونعم النصیر[1]۔ جب قوت صرف اسی کو حاصل ہے لا قوۃ الا باللہ حرکت کا بھی وہی مبدا ہے لاحول ولا قوۃ الا باللہ تو فعل جو حرکت و قوت ہی کا نتیجہ ہے صرف حق تعالٰی ہی کے لئے ثابت ہوتا ہے اور ذات خلق سے اس کی بالکلیہ نفی ہو جاتی ہے، اس حقیقت کے سمجھتے ہی اس کی بصر و بصیرت سے غفلت کا پردہ اٹھ جاتا ہے اور وہ لا تتحرک ذرۃ الا باذن اللہ[2] کے معنی سمجھ جاتا ہے، غیر اللہ سے استعانت کی نسبت کاٹ کر اسلم عبدی واستسلم کا مصداق بن جاتا ہے!

اپنے رب سے استعانت کے طریقے کیا ہیں؟ بصیرت محمدیہ نے جن طریقوں کی تعلیم فرمائی ہے، ان میں سے بعض یہ ہیں۔

اپنی حاجتوں اور مرادوں میں حق تعالٰی سے دعا کرو، دعا کا حکم ہے، اور اجابت کا وعدہ ادعونی استجب لکم۔ حق تعالٰی وجود مطلق ہیں، عطا محض ہیں، ان میں بخل کا شائبہ نہیں، مایوسی و محرومی ان کی درگاہ سے نہیں تشفی کے لئے فرما رہے ہیں لا تایئسوا من روح اللہ[3]۔ وہ حکیم بھی ہیں۔ ان کا ہر فعل حکمت رکھتا ہے، وہ ہمارے خیر کو ہم سے بہتر جانتے ہیں۔ اگر

---

[1] تمہیں اپنے مولٰی کا اعتصام چاہیے وہی تمہارا اچھا مولٰی ہے اور اچھا مددگار۔

[2] کوئی ذرۃ بغیر اللہ کے حکم کے حرکت نہیں کرتا۔

[3] اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔

وہ ہماری کسی دُعا کو قبول نہیں فرما رہے ہیں تو اُسے نہ قبول فرمانے ہی میں ہمارا فائدہ ہے، اِسی لئے کہا گیا ہے منعہ عطاءٌ مرد کا کمال اِس میں ہے کہ ان کی منع کو عطا جانے، کسی عاشق نے اسی جذبہ کے تحت کہا ہے ؎

اگر مراد تو اے دوست نامرادی ماست   مراد خویش دگر بار من نخواہم خواست

سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرمایا کرتے تھے لا ابالی علیٰ ای حال اصبح علیٰ ما اکرہ او علیٰ ما احب لانی لا ادری الخیر لا یھما[1] حق تعالیٰ خود ہمیں تعلیم فرما رہے ہیں، اور ایک نہایت دقیق نکتہ کی تعلیم فرما رہے ہیں۔

عسٰی ان تکرھوا شیئاً وھو خیر لکم و عسٰی ان تحبوا شیئاً وھو شر لکم وَ اللہ یعلم و انتم لا تعلمون[2] (البقرہ - ۱۰)

اسی نکتہ کو سمجھ کر عارف کہنے لگتا ہے' ہمہ آں باد کہ او خواہد آں مباد کہ ما خواہیم' اور خواجہ شبلی نے عارف کی تعریف ہی اس طرح کردی' کہ عارف او ست کہ منع ز داو لا دوست ترا ز عطا باشد" یہیں سے رضا کا مقام

---

[1] مجھے اس امر کی پروا نہیں کہ میں کسی حال میں صبح کرونگا۔ ایسی حالت میں جسکو میں پسند نہیں کرتا، یا ایسی حالت میں جس کو میں پسند کرتا ہوں' کیونکہ میں نہیں جانتا کہ میرے لیئے بھلائی کس حالت میں ہے۔

[2] شاید کہ بری لگے تم کو ایک چیز اور وہ بہتر ہو تمہارے حق میں اور شاید تم کو بھلی لگے ایک چیز اور وہ بری ہو تمہارے حق میں اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

شروع ہوجاتا ہے، جو استعانت کا بلند ترین طریقہ ہے۔

بہرحال اگر حق سبحانہ تعالےٰ کسی حکمت و مصلحت سے بندۂ مومن کی دُعا قبول نہیں فرماتے تو اس کے قلب کی حفاظت فرما دیتے ہیں، مطلوب کی جانب سے خیال پلٹ دیتے ہیں، حکایت شکایت، جزع فزع کی طرف مائل نہیں کرتے، رضا کے مقام میں پہنچا دیتے ہیں اور وہ بکل اجل کتاب کہہ کر حق تعالےٰ سے راضی ہو جاتا ہے، اجابت دُعا کی ایک صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ مطلوب تو حاصل نہیں ہوتا، لیکن حق تعالیٰ اس کی دعا کو رد نہیں فرماتے، بلکہ اس کی کسی بلا کو دُور کر دیتے ہیں گو اس کو بدل کا علم نہیں ہوتا، ایک آخری صورت یہ بھی ہے کہ مدعا اگر وہ دنیا میں نہیں پاتا تو آخرت کے لیئے یہ ذخیرہ کیا جاتا ہے،

ان العبد یریٰ فی صحائفہ	قیامت کے دن بندہ اپنے اعمال نامہ پر
یوم القیامۃ حسنات لایعرفھا	وہ نیکیاں دیکھے گا جن کو وہ نہیں پہچانیگا
فیقال انھا بدل سوالك فی	اس سے کہا جائیگا کہ یہ اس سوال کا بدل
الدنیا لم یقد رقضاءہ	ہیں جو تو نے دنیا میں کیا تھا۔ لیکن تیرے
فیھا۔ (حدیث)	مقدر میں دنیا میں ان کا ملنا نہ تھا۔

بہرصورت اجابتِ دُعا کا وعدہ سچا ہے، لیکن یہ وعدہ مطلق ہے، مقید نہیں کہ اسی وقت اور اسی صورت میں پورا کر دیا جائے، جس وقت اور جس صورت میں بندے نے دعا مانگی ہے فافھم، اگر آپ اس نکتہ کو سمجھ جائیں تو پھر آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ کیوں رسول عربی نے اس دعا کی تعلیم دی

اللھم اکفنی کل مھم من حیث شئت وکیف شئت وانی شئت ومن این شئت۔

استعانت کا دوسرا طریقہ اپنے کاموں میں حق تعالیٰ پر توکّل کرنا ہے، اگر ہمیں اس بات کا یقین ہو، محض علم نہیں، یعنی تحقّق ہو، محض تعقّل نہیں، یا جدید نفسیاتی اصطلاح میں یوں کہو کہ اگر یہ بات ہمارے تحت الشعوری نفس میں اتر گئی ہو کہ فاعل حقیقی حق تعالیٰ ہیں، کرنے والے خود بدولت ہیں افعال و آثار کا مرجع خود ہیں، حول و قوۃ کا مبدا خود ہیں، اور پھر اس کا بھی تیقّن ہو کہ ایمان کے بعد وہ رحیم بھی ہیں کان بالمومنین رحیما۔ ولی ہیں واللہ ولی المومنین تو ہم اپنے تمام امور ان کے تفویض کرنے میں خوشی سے آمادہ ہو جائیں گے، اور اس تفویض کے ساتھ ہی فکر سے آزاد ہو جائیں گے طمانیت و مسرّت سے ہمارے قلوب بھر جائیں گے اور کسی مست محبت کے الفاظ میں کہہ اٹھیں گے،

وکلت الیٰ المحبوب امری کلہ فان شاء احیانی وان شاء اتلفا[1]

توکّل اپنی حول و قوۃ سے بری ہونا ہے، اعتصام باللہ ہے۔ ذوالنون رح نے توکّل کی تعریف اسی طرح کی ہے التوکل ترک تدبیر النفس والانخلاع من الحول والقوۃ[2]۔ اور سری سقطی نے بھی ان کے ساتھ اتفاق کیا ہے

---

[1] میں نے اپنا کام اپنے محبوب کے حوالہ کیا، خواہ اب وہ مجھے زندہ رکھے یا مار ڈالے۔

[2] توکّل اپنے نفس کی تدبیر کو چھوڑنا، اور اپنی حول و قوت سے نکل آنا ہے۔

التوکل الانخلاع عن الحول والقوۃ ۔ ان تعریفوں کا ماخذ، حدیث نبویؐ لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہ، اور قول عز وجل لاقوۃ الا باللہ توکل قلبی عمل ہے، یعنی قلب میں یقین جاگزین ہو کہ مجھ میں اور کسی شئے میں نہ اثر ہے نہ قوت ہے نہ حرکت ہے، مجھ میں اور ہر شئے میں اثر وقوت وحرکت حق تعالیٰ ہی پیدا کرتے ہیں، وہ جس طرح میرے خالق ہیں، میرے افعال کے بھی خالق ہیں خلقکم وماتعلمون ۔ میرے اقتضاء فطرت، عین کے مطابق افعال کی تخلیق فرما رہے ہیں میرا اقتضا میرا اختیار ہے، لیکن فعل کی تخلیق حق تعالیٰ کی جانب سے ہو رہی ہے، اس لئے اسباب قطعیہ کے استعمال واختیار کا مجھے حکم ہے ۔ حکم کے تحت میں ان کو استعمال کر رہا ہوں، جانتا ہوں کہ اگر مجھے اولاد کی خواہش ہو تو جماع کو ترک نہیں کر سکتا ۔ بھوک کی تشفی کے لئے نوالہ کا اٹھانا اور اس کا چبانا اور حلق سے نیچے اتارنا قطعی ضروری ہے، توکل یہاں ترک عمل و تعقل کا نام نہیں، علم وحالت کا نام ہے، قلبی کیفیت کا نام ہے، اس یقین کا نام ہے کہ قدرت، حرکت، فعل سب حق تعالےٰ ہی کے حکم سے پیدا ہوئے ہیں، ان کی مشیت اور ارادے سے پیدا ہوئے ہیں، وہ چاہیں تو نوالہ منہ تک نہ پہنچے ہاتھ شل ہو جائے، کھانا بھی چھن جائے، نظر ان کے فعل پر ہے، فضل پر ہے، اپنے زور بازو پر نہیں، کسب پر نہیں، دست بکار دل بیار[1] ! توکل ترک اسباب نہیں، ترکِ رویتِ اسباب ہے

---

[1] حضرت شاہ میر قبلہ رحمہ۔

مبادیات کو سمجھ جانے کے بعد رزق کے مسئلہ پر ذرا غور کرو، رزق کا ذمہ حق تعالیٰ نے لیا ہے وما من دابة فی الارض الا علی اللہ رزقہا[1] صرف ذمہ داری پر اکتفا نہیں کیا، قسم بھی کھائی ہے، صرف قسم پر اکتفا نہیں کیا، مثال بھی بیان کی ہے وفی السماء رزقکم وما توعدون، فورب السماء والارض انہ لحق مثل ما انکم تنطقون (پارہ ۲۶ رکوع ۱۷) حق تعالیٰ ان لوگوں کو بھی رزق دیتے ہیں جو غفلت و معصیت میں مبتلا ہیں، فسق و فجور میں چور ہیں، پھر جو ان کی اطاعت و رعایت کرتے ہوں، وہ کیسے محروم ہو سکتے ہیں۔ دیکھو جو درخت بوتا ہے وہی سینچتا بھی ہے، مخلوقات کو وہی مدد دیتا ہے، جو ان کا خالق ہے، مخلوق کے لیئے یہ بات کافی ہے کہ ان کا خالق ان کو کافی ہے، الیس اللہ بکاف عبدہ ایجاد ان سے ہے، دوام امداد بھی ان ہی سے ہے، تخلیق ان سے ہوئی، رزق کا دینا بھی ان کے ذمہ ہے، اس کی مثال انسان اپنے نفس میں پاتا ہے، یہ جب کسی کو گھر پر دعوت دیتا ہے، تو اس کے لیئے غذا کا بھی انتظام کرتا ہے، حق تعالیٰ نے جب ہمیں اپنی مشیت و ارادے سے پیدا کیا ہے، تو رزق کی ذمہ داری بھی انہی پر ہے، ان ہی کے خوان کرم سے ہیں ریزہ خوا

---

[1] اور زمین پر کوئی چوپایہ نہیں جس کے رزق کا ذمہ اللہ پر نہیں۔

[2] اور آسمان میں ہے روزی تمہاری اور جو تم سے وعدہ کیا گیا، سو قسم ہے آسمان اور زمین کے رب کی یہ بات تحقیقی ہے جیسے کہ تم بولتے ہو۔

حاصل ہے، حق تعالیٰ ہمارے مولیٰ ہیں، آقا ہیں، ہم ان کے عبد ہیں، غلام ہیں، اب آقا پر غلام کا نفقہ ضروری ہے۔ جس طرح کہ غلام پر آقا کی اطاعت واجب ہے، اگر ہم ان کے ہو رہیں، ان کے سوا نہ کسی کی عبادت کریں، نہ کسی سے حاجت و مراد بر آری چاہیں، تو کیا یہ ممکن ہے وہ اپنا حق ادا نہ کریں[1]؟ اس کی بشارت اس آیۂ کریمہ میں دے رہے ہیں۔

من یتق اللہ یجعل لہ مخرجًا	جو تقویٰ اختیار کرتا ہے سر اللہ اس کے
ویرزقہ من حیث لا یحتسب	لئے راستہ نکالتے ہیں اور ایسی جگہ سے
ومن یتوکل علی اللہ فھو	رزق فراہم کرتے ہیں جہاں کسی کا
حسبہٗ۔	شان وگمان بھی نہیں ہوتا، جو اللہ پر

توکل کرتا ہے اللہ اس کے لئے کافی ہے۔

رزق کا وعدہ قطعی، صرف ہمیں اپنا حق عبادت وعبودیت ادا کرنا ہے۔ پھر ناممکن ہے کہ وہ ہمیں اپنے گھر بلائیں اور پھر ہمیں اپنے احسانات سے محروم رکھیں، وجود بخشی کریں، اور پھر مدد نہ کریں، ہمت کریں اور اپنے کرم سے محروم رکھیں، اپنا حق (عبادت) ہم سے طلب کریں، اور ہمارا حق (رزق) ہمیں نہ دیں! وہ کریم ہیں ان سے معاملہ کر کے ان کی خدمت ادا کر کے کون خسارے میں رہتا ہے۔

من ذا الذی سالک فحرمتہ والجاء الیک فاھملتہ اوتقرب

---

[1] مثالیں ابو الفضل اسکندری کی ہیں۔

الیکَ فابعدتہ او ھرب الیک فطردتہ[1] راتز (حضرت غوث اعظم)

اسی خیال کے تحت کسی عاشق نے کہا ہے، "گماں تو اینست کہ از رزق چارہ نیست اما رزق را از تو چارہ نیست" ؎

بدنبال روزی چہ باید دوید
تو بنشیں کہ روزی خود آید پدید

ایک دوسرے عاشق نے اسی خیال کو یوں ادا کیا ہے ؎

ہیں توکل کن بلرزاں پا و دست — رزق تو بر تو ز تو عاشق تر است

(مثنوی[2])

بہرحال اتباع سنت نبوت اسی میں ہے کہ رزق کی طلب میں کوشش کریں لیکن "اجملوا فی الطلب"[3] کو پیش نظر رکھکر اور یاد رکھیں۔ کہ ہماری طلب رزق کے حصول کا مستقل سبب یا قطعی علت نہیں، شاہ عبدالحق محدث دہلوی رح شارح فتوح الغیب نے مسئلہ کو اجمالاً خوب ادا کیا ہے" بعد از طلب می یابی اما نہ بہ طلب می یابی" یہی مفہوم اس شعر میں ادا ہوا ہے؎

بجستجوئے نیابد کسے مراد دلی — کسے مراد بیابد کہ جستجو دارد

(۱) شعر کا مطلب یہ ہے کہ جستجو کو مراد یابی کی مستقل علت قرار نہ دینی چاہیئے

---

(۱) [1] وہ کون ہے جس نے تجھ سے سوال کیا اور تو نے اس کو محروم رکھا، یا ملتجی ہوا اور تو نے اس کو بے کار چھوڑا، یا تجھ سے طلب چاہا اور تو نے اس کو دور کر دیا، تیری طرف دوڑ کر آیا، اور تو نے اس کو دھتکار دیا [2] یعنی دنیا کمانے میں دل توڑ کوشش نہ کرو۔

کیونکہ معاملہ فضل پر منحصر ہے، ہاں جستجو ضرور کی جائے عادت الٰہی یہی ہے کہ حرکت میں برکت دے دیتے ہیں۔

استعانت کا تیسرا طریقہ مصیبتوں میں صبر کرنا ہے۔

دنیا دار الحزن ہے ادار المحن ہے "سجن ہے" (قید خانہ) غم کی وادی ہے، شیطان کی دکان[۱] ہے، جس میں سوا شر و فساد کے کچھ نہیں۔

ان للدنیا و ایامھا فانما للحزن مخلوقة[۲]
ھمومھا لاتنقضی ساعةً عن ملک فیھا اوسوقة

درویش ہو کہ شاہ، امیر ہو کہ گدا سب غم و ہم میں مبتلا ہیں لقد خلقنا الانسان فی کبد[۳]۔ چونکہ حق تعالیٰ ہی ہماری غم سے آزمائش کرتے ہیں، مصیبت میں مبتلا کرتے ہیں، رلاتے اور ہنساتے ہیں و انه اضحك و ابكى۔ مارتے اور جلاتے ہیں۔ و انه هو امات و احيى۔ اور غنی کرتے اور فقیر کرتے ہیں۔ و انه هو اغنى و اقنى۔ اس لئے حق تعالیٰ ہی ہمیں مصائب سے بچنے کا طریقہ بھی بتاتے ہیں، اور وہ طریقہ صبر ہے۔ کیا حکیمانہ ارشاد ہے:۔

۱؎ قول یحییٰ بن معاذ۔

۲؎ دنیا اور ایام دنیا پر افسوس ہے کہ وہ حزن و غم کے لئے بنائی گئی ہے اس کے غم ایک گھڑی کے لئے ختم نہیں ہوتے، خواہ بادشاہ کے لئے ہوں یا بازاری آدمی کے لئے۔

۳؎ "ہم نے انسان کو سختی میں پیدا کیا۔"

یٰایھا الذین امنوا اصبروا و صابروا و رابطوا[1] و اتقوا اللہ لعلکم تفلحون ۝

ایمان والو موجودہ مصائب پر صبر کرو، دوسروں کے ساتھ صبر و استقلال سے کام لو (صابروا) اور ایسے کاموں میں ثابت قدم رہو جن کا وقت ابھی نہیں آیا (رابطوا) اور اللہ سے ڈرو اسی میں تمہاری فلاح و بہبودی ہے یہی نجاح کا راستہ ہے، صرف صبر اور حق تعالیٰ ہی کے حکم پر اصبر لحکم ربک اور حق تعالیٰ ہی کے لئے وما صبرک الا باللہ ہاں صرف صبر کرنے ہی سے مصائب کی برداشت سہل ہو جاتی ہے، غم کے بادل چھٹ جاتے ہیں، فکر کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے، اسباب کی راہ سے اگر انسان مصائب کو دور کرنا چاہے غم سے گلو خلاصی حاصل کرنا چاہے، اور راحت کی امید باندھے، تو سوائے حسرت و یاس کے کچھ نہیں ملتا، مولانائے رومؒ نے اسی چیز کو کس خوبی سے ادا فرمایا ہے :-

گر گریزی بامید راحتے — ہم ازانجا پیشت آید آفتے
ہیچ کنجے بے دد و بے دام نیست — جز بخلوت گاہ حق آرام نیست

(۲) حق تعالیٰ سے اگر محبت ہو، اور مصیبت کو ان ہی کی طرف سے دیکھیے، تو مصائب کا آسان ہونا ضروری ہے، اس کی مثال یوں سمجھو کہ تم ایک تاریک

---

[1] رباط کے معنی اعداء کے مقابلہ میں گھوڑے باندھنے کے ہیں یعنی مورچہ بندی۔ اور ظاہر ہے کہ مورچہ بندی حفظ ما تقدم کے لئے ہوتی ہے (مولانا اشرف علی تھانوی مدظلہ)۔

کمرے میں ہو، کوئی چیز تمہیں آلگی، اور تم تڑپ اٹھے، تمہیں معلوم نہیں کہ مارنیوالا کون ہے، جب تم نے چراغ منگوایا اور دیکھا کہ یہ تو تمہارا شیخ ہے، یا باپ ہے، یا کوئی عزیز،

محبوب ہستی ہے جس سے تم کسی صورت میں آزار کی توقع نہیں کرسکتے تو تمہارا یہ جاننا بیشک تمہاری تسلی اور صبر کا باعث ہوگا، کیونکہ تم اس تکلیف میں بھی دقائق لطف کا معاینہ کرو گے[۱]، اسی طرح وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ میں حق تعالیٰ اپنے بندۂ خاص سے بطریق منّت فرما رہے ہیں کہ اپنے پروردگار کی رضا و خوشنودی کے لیئے اس کے حکم و بلا پر صبر کرو، کیونکہ ایمان کی حلاوت اس وقت تک حاصل نہیں ہوتی جب تک کہ تیر بلا کا ہدف نہ بنے ؎

من ساختہ جاں را ہدف تیر بلایت!

اگر تم کو حق تعالیٰ کے بیحد مہربان ارحیم اور ودود ہونے کا یقین ہو جائے اِنَّ اللّٰهَ بِکُمۡ لَرَءُوۡفٌ رَّحِیۡمٌ پر ایمان ہو، کَانَ اللّٰهُ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا پر اذعان ہو اور وَاللّٰهُ ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِیۡمِ پر ایقان قائم ہو جائے، تو پھر تم اپنے دکھ درد کو پوشیدہ رحمت سمجھو گے، مثالوں سے اس نکتہ کو سمجھو، مشفق باپ اپنے بچے کو پچھنے لگاتا ہے لیکن دکھ پہنچانا مقصود نہیں ہوتا، فاسد خون جو اس کے بدن میں زہر ہے آسان طریقہ سے نکال رہا ہے! ماں اپنے چھوٹے بچے کو غلیظ دیکھنا نہیں چاہتی، صابون اور گرم پانی سے اس کو نہلاتی، اس کے جسم کو رگڑتی اور

---

[۱] یہ مثال ابوالعطا اسکندری نے دی ہے، بہ تغیر یسیر یہاں استعمال کی گئی۔

مالش کرتی ہے، بچہ چیختا چلاتا ہے، دکھ محسوس کرتا ہے، لیکن ماں کا مقصد آزار پہنچانا نہیں ہوتا، تمہارا خیر خواہ طبیب تمہیں ایارج دیتا ہے، اور تم اسے ناپسند کرتے ہو، لیکن اگر وہ تمہارے اختیار کا اتباع کرے تو شفا تم سے کوسوں بھاگے اگر تم کو کوئی ایسی چیز نہ دی جائے جس پر تمہارا دم نکل رہا ہو، اور تمہیں یہ اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ یہ نہ دینا عین شفقت و مہربانی کے باعث ہے، تو تم کہو گے کہ یہ نہ دینا ہی میرے حق میں دینا ہے۔ شیخ ابوالحسن شاذلی نے کیا خوب فرمایا ہے، جان لو کہ اگر حق تعالیٰ تم کو کوئی چیز نہیں عطاء فرماتے تو ان کا یہ نہ دینا بخل کی وجہ سے نہیں، بلکہ عین رحمت ہے، ان کا نہ دینا ہی دینا ہے، لیکن نہ دینے میں دینا وہی سمجھتا ہے جو صدیق ہے عسیٰ ان تکرھوا شیئًا ویجعل اللہ فیہ خیرًا کثیرًا[1] میں اسی راز کی طرف اشارہ ہے، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شدائد پر بھی اسی طرح شکر فرماتے جس طرح کہ نعمتوں پر الحمد للہ علی ما یساء و یسر۔[2]

(۱) صرف ایمان کی ضرورت ہے، اور شدت حب کی۔ ہر مصیبت کے وقت حق تعالیٰ کی جو تجلی ہوتی ہے، مومن کو اس تجلی میں ایسی حلاوت نصیب ہوتی ہے کہ وہ سختی غم کو آسانی سے جھیل لیتا ہے، اور اکثر اوقات غلبہ تجلی سے اس کو دکھ بھی نہیں محسوس ہوتا، یہ بات اگر تمہاری سمجھ میں نہ آرہی تو تم لیفا پر طعنہ

---

[1] شاید تم کسی چیز کو برا جانو اور اللہ تعالیٰ نے اس میں خیر کثیر رکھی ہو۔
[2] شکر ہے اللہ تعالیٰ کا اس چیز پر جو بری معلوم ہو اور جو خوش نظر آئے۔

کرنے والی حسین بیبیوں کے حال پر غور کرو۔ یوسفؑ کے ہوش ربا جمال سے وارفتہ ہو کر انہوں نے اپنا ہاتھ کاٹ لیا، اور خبر بھی نہ ہوئی کہ درد کیا چیز ہے فلما راینہ اکبرنہ وقطعن ایدیھن[1] زبانِ حال سے وہ کہہ رہی تھیں:۔

این است کہ خون خوردہ و دل بردہ بسے را   بسم اللہ اگر تابِ نظر است کسے را

شاید یہی معنی ہیں عرفا کے اس قول کے کہ "انس قرب سے ادراک الم مفقود ہو جاتا ہے۔

ایمان اور محبت میں پختہ ہونے کے بعد تم کو بیماریوں، بلاؤں، فاقوں میں وہ اسرار لطف و رحمت نظر آنے لگیں گے کہ تم کہہ اٹھو گے کہ رسول اللہ نے سچ فرمایا حفت الجنۃ بالمکارہ وحفت النار بالشہوات[2] بلاؤں اور مصیبتوں سے نفس دب جاتا ہے، ذلیل و خوار ہو جاتا ہے، حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، ان سے رابطہ قائم کر لیتا ہے، اور سبھوں سے ٹوٹ جاتا ہے، خلق سے فانی ہو جاتا ہے۔ غم سے زیادہ مؤثر سیرت سازی کے لئے کوئی اور شئے نہیں، غم ہی کے ذریعہ نفس کی خامیاں دور ہوتی ہیں، قلب کا تزکیہ ہو جاتا ہے، روح کا تجلیہ ہو جاتا ہے۔ بلا و غم کی وجہ سے اگر تم نے اپنے امراض قلبی کا معالجہ کر لیا، استقامت پیدا کر لی، تو یاد رکھو کہ غم نے تمہیں

---

[1] پھر جب دیکھا اس کو ششدر رہ گئیں اور کاٹ ڈالے اپنے ہاتھ۔

[2] جنت تو ان باتوں سے گھری ہوئی ہے، جو نفس کو ناگوار ہیں، اور دوزخ شہوتوں، خواہشوں سے گھری ہوئی ہے۔

فوزِ عظیم کے حاصل کرنے میں مدد دی، اور ایسے غم پر ہزاروں خوشیاں قربان ہیں، وہ خوشیاں جن کی وجہ سے تم شہوتوں میں گرفتار تھے، ہوا و ہوس کے شکار تھے، ظلمتوں میں گھرے ہوئے تھے، اور نور سے دور تھے، حق تعالیٰ سے تمہارا کوئی ربط نہ تھا، شیطان تمہارا قرین تھا، تم پر مسلط تھا، اور اس وعید کے تم مصداق تھے۔ وَمن یعش عن ذکر الرحمن نقیض له شیطانا فهو له قرین[1]۔

بلا کے اسی فلسفہ سے واقف ہو کر حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا کہ افضل عیش (بہترین زندگی) ہم نے صبر میں پائی، حضرت ابوبکر صدیقؓ بیمار ہوئے، لوگوں نے عیادت کی اور کہا کیا ہم طبیب کو بلائیں؟ فرمایا، طبیب نے مجھے دیکھ لیا، کہا کہ پھر کیا کہا؟ فرمایا کہ یہ کہا ہے کہ اِنّی فَعَّالٌ لِّمَا اُرِیْدُ[2]، معروف کرخیؒ فرمایا کرتے تھے، لیس بصادق فی دعواه من لم یتلذذ بضرب مولاه جو اپنے مولا کی ضرب سے متلذذ نہیں ہوتا، وہ سچا غلام نہیں، اپنے دعویٰ عبودیت میں صادق نہیں، بعض عارفین کی جیب میں یہ لکھا رہتا تھا واصبر لحکم ربک فانک باعیننا[3]۔ مصیبت کے وقت اس پر نظر ڈالتے، اور محض اس خیال سے

[1] اور جو کوئی آنکھ چرائے رحمن کی یاد سے ہم اس پر مقرر کردیں ایک شیطان پھر وہی رہے اس کا ساتھی۔

[2] وہی کرتا ہوں جو میں چاہوں۔

[3] اور اپنے رب کے حکم پر صبر کر، کیونکہ تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔

حق تعالیٰ ہماری اس مصیبت کو جانتے ہیں، دیکھ رہے ہیں، مجوبتے رقص کرتے۔ رسول اللہ نے اس آیۃ پر وجد فرمایا تھا اور ام المومنین عائشہ صدیقہ آپ کے پاؤں پر گر گئی تھیں، اس لئے سلف کے بعد بزرگ تعزیت مصائب یوں کیا کرتے تھے اصبر لحکم ربک۔ اس کے ساتھ اس قول نبوی صلعم کا سنا دینا بھی مومن کی خاص تسلی کا باعث ہو گا،

(۱)

اذا احب اللہ عبداً	جب اللہ بندہ سے محبت کرتا ہے تو اس کو
ابتلاہ فان صبر اجتباہ	مصیبت میں مبتلا کرتا ہے اگر وہ صبر کرے تو اپنا
وان رضی اصطفاہ۔	پسندیدہ اور راضی ہے تو برگزیدہ بنا لیتا ہے

اب ایک کلی نفسیاتی قانون پر غور کرو۔ انسان کے لئے مصیبتوں اور آفتوں کا برداشت کرنا اس وقت کسی قدر آسان اور سہل ہوتا ہے۔ جب اس کو کسی اچھے بدل کی توقع ہوتی ہے، مثلاً اگر میں اپنے وطن سے دور اہل و عیال سے علیحدہ کسی جگہ تمام دن محنت و مشقت میں گزار رہا ہوں تو واقعی میرے لئے یہ ایک مصیبت ہے، لیکن میں اسکو مصیبت نہیں سمجھتا، کیونکہ مہینہ کے ختم پر مجھے اس کا معاوضہ معقول تنخواہ کی صورت میں مل جاتا ہے یہ میرے غموں کو بھلا دیتا ہے، میرے زخموں کے لئے مرہم کا کام دیتا ہے۔ اسی اصول کو پیش نظر رکھ کر ان وعدوں اور بشارتوں پر غور کرو جو قرآن کریم میں اس شخص سے کی جا رہی ہے جو مبتلائے مصیبت ہے اور صبر کرتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا اور آخرت کی ساری بھلائیاں صبر ہی میں رکھی ہیں!

امام احمد رضی اللہ عنہ کی تحقیق ہے کہ قرآن میں صبر کا ذکر نوّے جگہ آیا ہے!

ہم یہاں چند ان بشارتوں کا ذکر کرتے ہیں جو صابر کے حق میں آئی ہیں، اگر وہ ان کو پیش نظر رکھے، ان پر یقین و اذعان کے ساتھ تفکر کرے تو چیخ اٹھے کہ " بلا از دوست عطاست واز عطا نالیدن خطاست!"

صبر سے ہم حق تعالیٰ کے محبوب بنتے ہیں ان اللہ یحب الصابرین[1]، اور جو حق تعالےٰ کا محبوب ہو اس کو کس چیز سے حزن ہو سکتا ہے، اور کس چیز سے خوف؟ صابر کو حق تعالیٰ کی معیت نصیب ہوتی ہے۔ ان اللہ مع الصابرین[2] اور یہ معیت سوکھی معیت نہیں، جس کے ساتھ حق تعالیٰ ہوں وہ کیسے ذلیل ہو سکتا ہے، کیسے مقہور ہو سکتا ہے، خلق اس کا کیا بگاڑ سکتی ہے؟ لاطاقۃ لمخلوق مع قدرۃ الخالق؛ صبر ہی سے امامت و پیشوائی نصیب ہوتی ہے وجعلنا منہم ائمۃ یہدون بامرنا لما صبروا[3]۔ خلق کی ہدایت کا منصب سپرد ہوتا ہے، صابر کے واسطے اس کا صبر اعدا کے مکر و فریب کے مقابلہ میں ایک زبردست سپر ہے وان تصبروا وتتقوا لایضرکم کیدھم شیئاً[4] بالآخر ان پر غالب ہونا اس کے لئے یقینی ہے فاصبر ان العاقبۃ للمتقین[5]۔ اس کا اپنے مطلب پر فائز ہونا ضروری ہے

---

[1] اللہ صبر کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

[2] اللہ صبر کرنے والے کے ساتھ ہے۔

[3] اور کئے ہم نے ان میں سے پیشوا جو راہ بتلاتے تھے ہمارے حکم سے جب وہ صبر کرتے رہے۔

[4] اگر تم صبر کرو اور اللہ سے ڈرو تو ان کے مکر سے تمہیں کوئی ضرر نہیں پہنچیگا۔

[5] پس صبر کرو کیونکہ متقین کا انجام نیک ہوتا ہے۔

وتمت کلمۃ ربك الحسنیٰ علی بنی اسرائیل بما صبروا! یعنی تیرے پروردگار نے جو وعدہ بنی اسرائیل کے ساتھ کیا تھا، یعنی دشمنوں سے نجات اور ملک و حکومت کے عطا کرنے کا وعدہ صبر ہی کی وجہ سے ایفا ہوا صابرین کے لیئے غیر محدود اجر کا وعدہ کیا ہے انما یوفی الصابرون اجرھم بغیر حساب۔ سلیمان بن قاسم نے کہا ہے کہ ہر عمل کا ثواب معلوم ہے مگر صبر کا اجر "بغیر حساب" ہو۔ نے کی وجہ سے نامعلوم و ناقابل علم! حق تعالےٰ نے صابروں کے لیئے اپنی رحمت، ہدایت اور صلوٰۃ یکجا جمع کیئے ہیں۔

اور یہ اکٹھے ان کے سوا کسی اور کو نہیں دیتے وبشر الصابرین الذین اذا اصابتھم مصیبۃ قالوا انا للہ و انا الیہ راجعون، اولٰئك علیھم صلوٰۃ من ربھم ورحمۃ و اولٰئك ھم المھتدون [1]

اگر درد، گریز پا، سریع الزوال، فانی درد صبر کے ساتھ برداشت کر لیا جائے اور اس کی برداشت ناممکن بھی نہیں کیونکہ ناقابل برداشت تکلیف کسی کو دی بھی نہیں جاتی، تو دیکھو اس کے معاوضہ میں کیا مل رہا ہے؟ کن چیزوں کا وعدہ ہو رہا ہے؟ اور کون وعدہ کر رہا ہے!

---

[1] اور بشارت دو صابرین کو جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ ہی کی طرف رجوع کرنے والے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جن پر ان کے پروردگار کے صلوٰت ہیں اور رحمت اور یہی ہدایت یافتہ ہیں۔

کس کی زبانی وعدہ کیا جا رہا ہے؟ اگر تمہارے قلب میں ایمان کی شمع روشن ہے[1]، اگر وہ "غلاف" میں نہیں باندھ دیا گیا ہے، اوندھا نہیں ہو گیا ہے، اگر وہ ادراک کی قوت رکھتا ہے اور ان حقائق کا ادراک کر رہا ہے تو کیا وہ اس کے لئے ایک تڑپ سا بے چین نہیں، وہ اس سے متلذذ نہیں ہو گا اس کا مشتاق نہ ہوگا، اور فرطِ اشتیاق میں یہ چیخ اس کی زبان سے نہیں نکلے گی،

زہر غم دوست جز شکر نیست ایں تیر نصیب ہر جگر نیست
بر کے دہد آں حبیب جانی شیریں بود ارچہ تلخ دانی

اب غور کرو اس حدیث کے مفہوم پر۔

یتعاهد الله عبده بالبلاء کما یتعاهد الوالد الشفیق ولده۔

حق تعالیٰ اپنے بندہ کی بلا کے ذریعہ خبر گیری کرتے ہیں اسی طرح جس طرح کہ مہربان باپ اپنے بچے کی خبر گیری کرتا ہے۔

صحابہ کرام کے یہی ادراکات تھے اور ان ہی کی قوت سے انہوں نے اپنا سارا تن من دھن اسلام کی راہ میں قربان کر دیا تھا، رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ۔

---

[1] ابو سعید سے مرفوعاً روایت ہے۔ قلوب چار طرح کے ہوتے ہیں (۱) اجرد یعنی صاف، اس میں چراغ سا جلتا ہے، یہ مومن کا دل ہے (۲) اغلف جس کو غلاف میں باندھ دیا گیا ہے یہ کافر کا دل ہے (۳) منکوس یعنی اوندھا، یہ خالص منافق کا دل ہے (۴) مصفح وہ دل ہے جس میں ایمان و نفاق دونوں موجود ہیں یعنی زبانی ایمان کا دعویٰ اور دل میں اس کا یقین نہیں۔

صبر کا ادب یہ ہے کہ زبان کو شکوہ شکایت سے روکا جائے سوائے حق تعالیٰ کے اپنی مصیبت کا کسی سے گلہ نہ کیا جائے انما اشکو بثی وحزنی الی اللہ[1]

درد مہ نہاں بہ زطبیبانِ مدعی — باشد کہ از خزانہ غیبم دوا کنند

غور تو کرو کہ مخلوق سے شکوہ کرنے کے کیا معنی ہیں یہی نہ کہ ایک غیر رحیم و غیر کریم ہستی سے شکوہ کیا جا رہا ہے، ایسا شخص کبھی حق تعالیٰ کی اطاعت کی حلاوت اپنے دل میں نہ پائے گا، راس صبر یہ ہے کہ مصیبت کو چھپایا جائے من کنوز البرکتان المصائب وما صبر من بث[2] ۔ (حدیث انس مرفوعًا) لیکن مصیبت میں یا درد کی حالت میں زبان سے نالے وائے نکل جائے تو یہ منافیٔ صبر نہیں بشرطیکہ ان سے شکوہ شکایت مقصود نہ ہو، اور محض استراحت منظور ہو، کیونکہ کراہنے سے توجہ درد کی طرف سے ہٹ کر اس میں ایک قسم کی کمی محسوس ہوتی ہے اسی لئے "انین" (نالہ) کی دوسری قسم کے متعلق حکم ہے کہ لا یکرہ ولا یقدح فی الصبر۔ یعنی صبر کے منافی نہیں اور پہلی قسم کو بہ روایت امام احمدؒ قادح صبر قرار دیا گیا ہے۔
بلا اور مصیبت کے وقت صبر کے معنی یہی ہیں کہ توافق بالقضا کیا جائے

---

[1] میں تو کہتا ہوں اپنا اضطراب و غم اللہ کے سامنے۔
[2] نیکی کا خزانہ مصائب کے چھپانے میں ہے، جس نے اپنے مصائب کو ظاہر کر دیا اس نے صبر نہیں کیا۔

نظری طور پر رو محزون ہو رہا ہو اور ہو گا کیسے نہیں یہ تو اقتضائے بشریت ہے، انسان کامل رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ابراہیم کے انتقال پر فرماتے تھے انا بفراقک یاابراھیم لمحزون دیترے فراق نے اسے ابراہیم ہمیں محزون کر رکھا ہے) لیکن عقلی صدمہ نہ ہونا چاہیے یعنی اس مصیبت کے واقعہ کو بے محل اور قبل از وقت خیال نہ کیا جائے اس کے ساتھ توافق کیا جائے، زبان پر ہو ؎

ہر چہ آں خسرو کند شیریں بود

اور دل میں یہ خیال ہو ؎

جہاں دار داند جہاں داشتن

اب حکم کے تحت اسباب قطعیہ کا استعمال جائز ہے، بلکہ ضروری ہے، اور انسان کی فطرت ہی ایسی واقع ہوئی ہے کہ بغیر چارۂ کار اختیار کرنے کے خاموش نہیں رہتی، لیکن اسباب کے استعمال میں نظر اسباب پر نہ ہو مسبب پر ہو تو اسباب پر اثر پیدا ہوتا ہے، علاج کا یہ طریقہ استعمال کیا جائے، اس کے تمام اجزاء کو سمجھ کر ان کی پابندی کی جائے تو رفتہ رفتہ رضا کا مقام حاصل ہو جاتا ہے جو راحت کبریٰ ہے، دنیا میں جنت عالیہ ہے،

استعانت کا چوتھا طریقہ حق تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنا ہے۔

انسان کی زندگی میں غم بھی ہے اور خوشی بھی، رنج بھی ہے اور راحت بھی ہے، ظلمت بھی ہے اور نور بھی، فلاسفۂ یونان نے اپنی کوتاہ عقل سے دنیا کے مبدا ہی کو شر قرار دیا، اور بالآخر ہمہ شیطنت (PANDIA BOLISM) کے نظریہ کے حامی

بن گئے، ان کے تجربہ میں یہ دنیا بدترین دنیا ثابت ہوئی، سوائے غم و حزن کے کوئی شئے انہیں حقیقی نظر نہ آئی، اس کے برخلاف رجائیہ نے اس دنیا کو بہترین دنیا قرار دیا، غم و الم ان کی رائے میں محض منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے ہیں، تضاد سے لذت کی کیفیت میں اشتداد پیدا کرتے ہیں، حقیقی نہیں اعتباری ہیں لیکن سچ تو یہ ہے کہ اس دنیا میں غم بھی حقیقی ہے اور خوشی بھی حقیقی، ان میں سے کسی کو التباس قرار دینا خود کو دھوکے میں مبتلا کرنا ہے، حقیقت سے چشم پوشی کرنا ہے۔ اس کی تصدیق ہر شخص اپنے تجربہ سے ہر روز کر رہا ہے، وہ نہ بلا کو قائم پاتا ہے نہ نعمت کو، ہر دو سے گزر رہا ہے خوشی کے احساس کا انکار کر سکتا ہے، نہ غم کے ادراک کا، بلا و نعمت کا پایا جانا ان کو محسوس ہوتا ہے، اور یہیں بارکلے[1] کی بات صحیح معلوم ہوتی ہے کہ موجود ہونا دراصل محسوس ہونا ہی ہے۔ ESSE LIST PERCOPI

بات یہ ہے کہ حق تعالےٰ کے اسماء جلالی بھی ہیں اور جمالی ہیں اور یہ ہر وقت مصروف عمل ہیں، ایک لحظہ کے لئے معطل اور بے کار نہیں، خیر و شر، رنج و راحت، لذت و الم، نعمت و بلا، انہی کی تجلیات کا نتیجہ ہیں، اور حقیقی ہیں۔

---

[1] تصوریت کا بانی اٹھارھویں صدی مسیحی کا ایک نہایت ذہین اور تیز فہم فلسفی ۱۶۸۵ء تا ۱۷۵۳ء مادہ کے وجود ہی سے انکار کیا، کائنات غیر مادی روحانی شئے ہے اور محض نفوس یا ارواح کی جمعیت پر مشتمل ہے۔

انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ بلا سے نجات چاہتا ہے، اور نعمت میں اضافہ
بصیرت محمدیہ نے دونوں کے لیئے قلبی طریقے بتلائے ہیں، بلاؤں میں صبر اور
نعمتوں میں شکر قلب انسانی میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیتے ہیں۔
اس کو ایک طرف تو نالہ فریاد، ماتم سینہ کوبی، یاس و قنوط سے نجات دیتے
ہیں، اور دوسری طرف کبر، عجب، فخر، غرور، تبختر سے چھڑاتے ہیں۔ ان سلبی
و سفلی جذبات سے نجات پاکر وہ قوت، ہمت اور عمل کا مخزن بن جاتا ہے،
اور اس کے لیئے کائنات کی تسخیر آسان ہو جاتی ہے، اس کی توانائیاں
رایئگاں نہیں جاتیں صحیح جانب لگ جاتی ہیں، اور ایک نقطہ پر مرکوز ہو کر حیرت
انگیز نتائج پیدا کرتی ہیں، مصیبت میں صرف اتنی احتیاط ضروری ہے کہ ارادہ
بالکل شکستہ نہ ہو جائے، ہمت بالکل ٹوٹ نہ جائے، بلا کا بہادری سے
مقابلہ کیا جائے، حواس بجا ہوں یہی چیز صبر سے حاصل ہوتی ہے، اور
نعمت میں خطرہ اس بات کا لگا رہتا ہے کہ وہ حق تعالیٰ کو بھول نہ جائے
جو تمام حسنات و محامد کا منبع ہیں، اور اس طرح اس منبع سے دور نہ ہو جائے
اور ظلمتوں میں گرفتار نہ ہو جائے، شکر سے یہ خطرہ رفع ہو جاتا ہے، کیونکہ
شکر کی حقیقت یہ ہے کہ نعمت کو حق تعالیٰ کی جانب سے دیکھا جائے، اپنی
ذات یا خلق کی طرف اس کی نسبت نہ کی جائے، کیونکہ در اصل حق تعالےٰ
ہی ضار ہیں، اور نافع، نفع و ضرر انہی کے دست قدرت میں ہیں، گو حواس
کی نگاہ کو یہی نظر آتا ہے کہ نعمت خلق ہی کے ہاتھ سے پہنچ رہی ہے لیکن چشم
بصیرت جانتی ہے کہ یہ محض بمنزلہ اسباب و آلات نعمت ہیں، قاسم، مجری و

فاعل و مسبّب حق تعالیٰ ہی ہیں وَمَا بِكُمْ مِنْ نِعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۔ جب انسان اس حقیقت کو ہمیش نظر رکھکر حق تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے تو وہ اس کی نعمتوں میں اضافہ کرتے ہیں، یہ ان کا قطعی وعدہ ہے، کسی استثناء کی گنجایش نہیں لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ[1] اجابت دُعا، رزق و غناء توبہ و مغفرت کا انحصار اپنی مرضی پر رکھا ہے، لیکن شکر کے عوض زیادتی نعمت کا حصول بلا اختلاف ہے، اسی لیئے حضور انور صلی اللّٰہ علیہ وسلم نے فرمایا :-

من نزلت الیہ نعمتہ فلیشکرھا، جس کسی پر نعمت کا نزول ہو، اس کو چاہیئے کہ شکر ادا کرے،

سیّد مرسلان و مرسل راز ۔۔۔ داد فرمان بشکر نعمت و ناز
گل نعمت را سے ہر کہ شگفت ۔۔۔ شکر آں روز و شب بباید گفت

اس عظیم الشان صداقت کو جس پر نعمتوں کی بقا منحصر ہے افصح العرب والعجم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور نفسیاتی طریقے سے ادا فرمایا ہے

اَلنِّعْمَةُ وَحْشِيَّةٌ قَيِّدُوْهَا بِالشُّكْرِ ۔۔ نعمت ایک وحشی جانور ہے شکر کی زنجیروں سے اس کو باندھ رکھو ۔

خاتم ملک وحی و خاتم دین ۔۔۔ شکر فرمود بر خفیف و سمین
بانہ نعمت چو ہست وحشی را ۔۔۔ صید از قید شکر کن اور را
چوں گزاری تو شکر، نستیزد ۔۔۔ ور شوی ناسپاس بگریزد

---

[1] اگر تم شکر کرو تو یقیناً ہم (نعمتوں میں) اضافہ کرتے ہیں۔

نفسیات کا یہ ایک مسلمہ قانون ہے کہ انسان کو جب یہ نعمت حاصل ہوتی ہے تو وہ خوش ہوتا ہے، لیکن چند روز بعد یہ نعمت اپنی مانوسیت کی وجہ سے اپنی قدر و قیمت کھو دیتی ہے، اب اس میں کوئی ندرت باقی نہیں رہتی، اس کے باوجود سے اس کو کوئی خاص فرق اپنی زندگی میں محسوس نہیں ہوتا، اور باوجود ناز و نعم میں گھرے ہونے کے وہ ضیق محسوس کرتا ہے، لیکن اگر یہ مفقود ہو جائے، یا ہاتھ سے چھین لی جائے تو اب اس کو اس کی قدر ہوتی ہے، قدر نعمت بعد زوال اسی صداقت کا اظہار ہے، علاوہ ازیں احساس نعمت کا مفقود ہونا گویا نعمت ہی کا مفقود ہوتا ہے، اگر نعمت سے مجھے خوشی نہ ہو، کوفت ہو، تعب ہو، تو یہ میرے لئے نعمت نہیں زحمت ہو ان حقائق کو سمجھ لینے کے بعد تمہیں معلوم ہوگا کہ از دیار نعمت میں شکر کا کتنا دخل ہے، نعمت کے شعور سے نعمت کا بقا یا ہے، شعور کا فقدان نعمت کا فقدان ہے، اسی لئے احساس نعمت کو زندہ رکھنا چاہیے، اور یہی چیز شکر سے حاصل ہوتی ہے، حضرت حسن بصریؒ شکر کو "جالب" "حافظ" کہتے تھے کیونکہ وہ موجودہ نعمتوں کی "حافظ" اور مفقود نعمتوں کی "جالب" ہے۔ شکر سے نعمت سلب و نقصان سے محفوظ ہو جاتی ہے، اور چونکہ شعور میں نعمتوں کے ادراک کی قوت پیدا ہو جاتی ہے، وہ ان چھوٹی چھوٹی عنایتوں کا بھی مشاہدہ کرنے لگتا ہے جو اس کے قبل نظر سے پوشیدہ تھیں۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ شکر سے نعمتوں میں قطعی اضافہ ہوتا ہے الشاکر یستحق المزید (شاکر زیادتی کا مستحق ہے) ایک نفسیاتی صداقت ہے اسی لئے

ہمارے اسوۂ حسنہ کو جب بھی کوئی امر خوشی کا پیش آتا تو شکر الٰہی کی ادائی کے لیے سجدہ میں گر جاتے (رواہ احمد)

انسان کی کچھ عجیب فطرت ہے، نعمتوں کو بہت جلد بھول جاتا ہے، اور مصیبتوں کا ہمیشہ شکوہ کرتا رہتا ہے، کسی عرب شاعر نے اس پر خوب تنبیہ کی ہے۔

یا ایتہا الظالم فی فعلہ   والظلم مردود علی من ظلم[1]

الی متی و حتی متی   تشکو المصیبات وتنسی النعم

ذرا ہمیں اپنی ان نعمتوں کو دہرانا چاہیے جن کی طرف ہماری نظر نہیں جاتی، پہلے "نعمت نفع" کو لیجیے، پھر "نعمت دفع" کو دونوں بیشمار ہیں "نعمت نفع" میں آدمی اپنے صحیح و سالم قد و قامت پر نظر کرے، صحت و عافیت پر غور کرے، ان لذتوں کا خیال کرے جو کھانے پینے اور جنسی خواہشوں کی تکمیل میں اس کو میسر ہیں، پھر "نعمت دفع" کے سلسلہ میں یہ دیکھے کہ وہ اپاہج نہیں ہزاروں بیماریوں سے محفوظ ہے، دشمنوں اور مخالفوں کے شر سے مامون ہے، صاحب ایمان پھر نعمت کو ایک اور نقطۂ نظر سے دیکھ سکتا ہے اس کو "نعمت توفیق" بھی حاصل ہے اور "نعمت عصمت" بھی نعمت توفیق یہ کہ اس کو ایمان توحید، صدق و استقامت حاصل ہے، نعمت عصمت یہ کہ وہ کفر و شرک، نفاق و ارتداد، بدعت و فسق و غفلت سے محفوظ

---

[1] اے اپنے فعل میں ظلم کے روا رکھنے والے تجھے معلوم ہے کہ ظلم ظالم پر لوٹ کر آتا ہے کب تک اور کہاں تک تو مصیبتوں کا شکوہ کرتا رہے گا اور نعمتوں کو بھلاتا جائے گا؟

لکھا گیا ہے، اگر ان نعمتوں کی وہ تفصیلات میں جائے، ان کی جزا پر نظر کرے، اپنی صلاحیت واستعداد پر غور کرے، یہ دیکھے کہ اس کو ان نعمتوں کا کیا حق ہے تو بے اختیار چیخ اٹھے،

بے لطف تو من قرار نتوانم کرد — احسان تو شمار نتوانم کرد
گر بر تن من زبان شود ہر موئے — یک شکر تو از ہزار نتوانم کرد

(ابوسعید مہنہ)

سچ ہے ان تعدوا نعمۃ اللّٰہ لا تحصوھا (اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرو تو گن نہ سکوگے) اب ان لاتعداد احسان کا شکر انسان کیسے ادا کر سکتا ہے، اسی لئے کہا گیا ہے کہ شکر "ادائے شکر سے اپنے عجز کا جان لینا ہے"۔ ادائے شکر کے ساتھ ہی ایک اور شکر لازم آتا ہے، کیونکہ شکر کی توفیق بھی تو حق تعالیٰ کی جانب سے ہوتی ہے اور یہ توفیق خود ایک بڑی نعمت ہے، جس کا شکر ضروری ہوا، پھر اس کا شکر وھَلُمَّ جرًّا الیٰ نِہَایَۃٍ ۔ اس لئے احسان و منّت باری تعالےٰ کا مشاہدہ خود شکر ہے، ان کی نعمتوں کا اعتراف خود شکر ہے، ان کے حصول کے بعد مرضیاتِ حق پر قائم رہنے کی دعا خود شکر ہے، ان پر حق تعالیٰ کی ثنا خود شکر ہے!

حق تعالیٰ سے استعانت کے دوسرے طریقے اجمالاً یہ ہیں، ہمیں چاہیئے کہ گناہوں کے صدور پر توبہ کریں، حق تعالیٰ مغفرت سے ہماری استعانت فرماتے ہیں انہ کان للاوابین غفورًا (وہ رجوع کرنے والے کو معاف کرتے ہیں، کتنا تسکین بخش اور محبت آمیز پیام ہے، انی غفار لمن تاب

وامن وعمل صالحاً ثم اهتدیٰ، میں معاف کردیتا ہوں اس کو جس نے توبہ کی، ایمان لایا، نیک عمل کیئے اور پھر اس راستہ پر چلا، توبہ و ندامت سے گناہ کی سیاہی قلب سے محو ہو جاتی ہے، گناہوں سے تنفّر پیدا ہو جاتا ہے نیکیوں سے محبت پیدا ہو جاتی ہے، اور تائب حق تعالیٰ کا محبوب ہو جاتا ہے

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ ؕ

ہم نے اُوپر تفصیل سے دکھایا ہے کہ قوت و اثر، اصالۃً حق تعالیٰ ہی کے لیئے ثابت ہیں لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ہماری خوف و رجا کی نسبت صرف حق تعالیٰ سے قائم ہو جاتی ہے اور اس کے قیام کے ساتھ ہی حق تعالیٰ ہمیں مخلوق سے غنی اور بے نیاز کر دیتے ہیں، اور اس غنا کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم اس قاتل جذبہ کے چنگل سے آزاد ہو جاتے ہیں جس نے سگ پرستوں کی زندگی کو سکون و طمانیت سے ہمیشہ کے لیئے محروم کر دیا ہے یہ خوف کا جذبہ ہے جس نے ان کو سوتے جاگتے ہر وقت پریشان، مضطر اور ہوش باختہ کر رکھا ہے اور جس کی وجہ سے انہیں ہر کونہ میں ایک ناگ دکھائی دیتا ہے اور ہر گوشہ میں ایک درندہ۔

اگر ہم اس امر میں حق تعالےٰ سے استعانت چاہیں کہ وہ ہمیشہ یاد رکھیں اور ہم سے راضی رہیں، تو ہمیں چاہیئے کہ ہم حق تعالیٰ کو یاد رکھیں اور ان کے ہر حکم و فعل سے راضی ہو جائیں فاذکرونی اذکرکم، تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا، اسی لیئے فرمایا کہ اذکروا اللّٰه ذکرا کثیرًا، اور ہمارے راضی ہو جانے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ہم سے راضی ہو جاتے رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہم و رضوا عنہ

آناں کہ رضائے حق بجاں مے جویند — در راہِ رضا ستّہ از سر می پویند
ہر یک ہمہ آں کنند کہ حق فرماید — حق نیز ہماں کند کہ ایشاں گویند

اوپر جو کچھ ہم نے کہا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مذہب یا دین مشتمل ہے
دو اجزاء پر: عبادت و استعانت پر۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ
کی قلبی تصدیق اور لسانی اقرار سے ہمارے قلوب سے غیر اللہ کی معبودیت
و ربوبیت فنا ہو جاتی ہے، اس قلب کی عظمت کا کیا کہنا جس سے غیر اللہ
کی معبودیت و ربوبیت فنا ہو کر اللہ کی ربوبیت و معبودیت متمکن ہو گئی
ہے، جس کے الٰہ قطعاً اللہ ہیں، یعنی جس کے معبود، جس کے مسجود، جس کے
مطلوب، جس کے مقصود قطعاً اللہ ہیں، جس کے رب جس کے مستعان قطعاً
اللہ ہیں! اس قلب میں توحید کا جلوہ ہے، ایمان کا نور ہے، وہ نورانی
قلب ہے، حق تعالیٰ کا محبوب ہے اور حق تعالیٰ اس کے وکیل ہیں، کفیل
ہیں، ولی ہیں، مولیٰ ہیں، نصیر ہیں، حفیظ ہیں، اور ہادی ہیں۔

اس ضمن میں چند تعریفات یاد رکھو، جیسا کہ تم نے دیکھا ہے۔ ذات اللہ
ہی کو الٰہ قرار دینا، یعنی معبود و مستعان قرار دینا، زبان سے اقرار اور دل سے
اس کی تصدیق کرنا، توحید ہے، اس اقرار و تصدیق سے قلب سے شرک کا
خروج ہوتا ہے اور توحید داخل ہو جاتی ہے، جس ذاتِ پاک نے یہ پیام
ہم تک پہنچایا (محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) اس کی رسالت کے اقرار
و تصدیق سے دل سے کفر کا خروج ہو جاتا ہے اور ایمان جلوہ افروز ہو جاتا
ہے۔ ایمان میں دو چیزیں ہیں، اور توحید میں بھی دو چیزیں۔ ایمان میں

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور صرف اللہ وحدہ لا شریک لہٗ کی الوہیت کی تصدیق ہے، توحید میں اللہ تعالیٰ کی معبودیت و ربوبیت اور اُن کے ماتحت بندہ کی عبادت و استعانت کی تصدیق داخل ہے، اس کا زبان سے اقرار اور دل سے انکار یا شک، نفاق ہے، اسکی تصدیق کے بعد انکار، ارتداد ہے، یہ مثل شرک کے دین و مذہب کی نفی ہے، بغاوت ہے اور اس لیئے ناقابل معافی! اور بدعت بھی بڑی بلا ہے، یہ دین میں کسی نئی بات کا پیدا کرنا ہے، جو دین کی بات نہیں اس کو دین سمجھنا ہے غیر شریعت کو شریعت بتلانا افترا علی اللہ اور ایک گونہ "ادعائے نبوت" ہے، بدعتی کو توبہ کم نصیب ہوتی ہے کیونکہ وہ تو اس کو مستحسن سمجھ رہا ہے پھر توبہ کیوں کرے گا، اسی لیئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ وَكُلُّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ۔

قبل ایمان کفر و شرک سے توبہ لازم ہے، پھر ایمان یعنی لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کی قلبی تصدیق اور لسانی اقرار جس سے غیر اللہ کی معبودیت اور ربوبیت فنا ہو کر اللہ کی معبودیت و ربوبیت متمکن ہو جائے اب نفاق، ارتداد، بدعت، فسق و فجور سے احتراز، ایمان اور عمل صالح پر استقامت، یہ ہے دین یا "بندگی" جس کے متعلق عارف رُومؒ نے کیا خوب کہا ہے:

گر تو خواہی حرّی دل بندگی — بندگی کن بندگی کن بندگی
زندگی مقصود بہر بندگی است — زندگی بے بندگی شرمندگی است
جز خضوع و بندگی و اضطرار — اندریں حضرت ندارد اعتبار

ہر کہ اندر عشق یابد زندگی کفر باشد پیش او جز بندگی

ذوق باید تا دہد طاعات بر

مغز باید تا دہد دانہ شجر

قل ھٰذہٖ سبیلی ادعوا الی اللہ علی بصیرۃ انا ومن اتبعنی وسبحان اللہ وما انا من المشرکین (یوسف ۱۲۴)

ضمیمہ

مندرجۂ ذیل نقشہ سے دین کے سارے اجزاء کی تلخیص پیش نظر ہو جاتی ہے۔

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ　　　مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ

ذات خلق　　ذاتِ اللہ

معبودیت　ربوبیت　معبودیت　ربوبیت

عبادت　استعانت　عبادت　استعانت

نماز روزہ زکوٰۃ حج　اتباع اوامر و اجتناب نواہی قربانی نذر و منت وغیرہ　توبہ دعا توکل صبر شکر خوف رجا ذکر رضا

نیکی علم ہے

علمے کہ درو عمل نباشد عار است — ہر سجہ کہ بے ذکر بود زنار است
ہر کس کہ بہ علم بے عمل می نازد — عالم نبود اعمیٰ مشعل دار است

(امیر علی جرو باخانی)

یونان کے شہرۂ آفاق مفکر سقراط کی تعلیمات کا خلاصہ پوچھا جائے تو بس یہی مشہور قول ہے کہ نیکی علم ہے اور بدی جہل۔ اس سے سقراط کا بظاہر یہی مطلب تھا کہ عمل صالح (نیکی) علم صحیح کا نتیجہ ہے اور علم صحیح تیقن کے درجے میں عمل نیک سے جدا و منفک نہیں، ان میں سے ایک ضروری و لزومی ربط پایا جاتا ہے یہ لازم و ملزوم ہیں، سچ پوچھو تو ارباب علم کی تعریف ہی اس طرح کی جا سکتی ہے الذین یعملون بما یعلمون۔ یعنی یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے علم پر عمل کرتے ہیں[1] ہر کتاب خواں و کتاب دان عالم نہیں قرار دیا جا سکتا، وہ عالم نہیں مثلاً ذ یا المسائل، مسائل علمیہ کا حافظ اور ان سے

---

[1] رواہ الدارمی۔

لذت اندوز ہونے والا ہے، عوام کا یہ ظن محض ہے کہ ہر کرم کتابی کو وہ عالم سمجھتے ہیں، "اعمیٰ اشعل دار" کو بینا جانتے ہیں اور اپنی اس وہم کی تائید میں تمثیل سے کام لیتے ہیں، اس مختصر مقالہ کا مقصود اس بنیادی غلطی کا ارتفاع اور اس کی تائید میں جو دلائل پیش کئے جاتے ہیں ان کا ابطال ہے ؎

یک تنقیۂ دماغ ہمی باید کرد

ذرا سقراط کے اس قول کو کہ "نیکی علم ہے" اور وضاحت کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کرو۔ کیا علم صحیح عمل صالح کے لئے ضروری نہیں؟ کیا جہاز رانی کے لئے جہاز کی ساخت اور اس کے کام سے واقف ہونا ضروری نہیں؟ اسی طرح کیا حکمرانی کے لئے مملکت کی ماہیت و مقصد و غایت کا جاننا لازمی نہیں؟ بالکل اسی طرح جب تک ہم یہ نہ جانیں کہ نیکی کیا ہے جب تک کہ یہ معلوم نہ ہو کہ خصائل حسنہ کیا ہیں، تقویٰ کیا ہے، عفت و شجاعت کیا ہے، حکمت و عدالت کیا ہیں۔ اور ان کی ضد خصائل سیئہ کیا ہیں، کیا ہم نیک بن سکتے ہیں، تقویٰ اپنے اندر پیدا کر سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں، لیکن جب یہ معلوم ہو جائے کہ نیکی کیا ہے، ہم نیک بن سکتے ہیں!

یہاں تک تو عوام کو بھی سقراط کی رائے سے اتفاق ہوگا کہ جب تک آدمی کو نیکی کا علم نہ ہو وہ نیک نہیں بن سکتا، اس معنی میں قطعاً نیکی علم ہے، لیکن سقراط فطرت انسانی کا رازدار تھا، اس کی رائے میں فطرت انسانی کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ شر کو خیر پر ترجیح دے، وہ قطعاً خیر ہی کا ساتھ دے گی، کیونکہ خیر ہی میں اس کا ذاتی فائدہ ہے، نفع ہے، بھلا ہے، خیر کے

ہم سب عاشق ہیں، خیر ہی ہمارا محبوب ہے، ہم سب اسی کے پروانے ہیں
یہ ممکن ہے کہ جہل کی وجہ سے ہمیں شر خیر نظر آئے، شر کو ہم خیر سمجھنے لگیں،
اور اس علم یا عمل کی وجہ سے شر کا ساتھ دیں اور اس کو اختیار کریں ؛
لیکن یہ ہماری فطرت کا قصور نہیں، یہ ہمارے ارادہ کا نقص نہیں، یہ ہمارے
علم کا قصور ہے، جہل کی تاریکی میں ہمیں خیر کے صحیح خدو خال نظر نہیں
آتے اور ہم سراب کو آب سمجھنے لگتے ہیں اور اس پر گرتے ہیں، اسی لئے "بدی
جہل ہے" اور صرف جہل ہی بدی ہے ! اور جہل نام ہے علم صحیح کے
فقدان کا ! جہل میں بھی جو علم نظر آتا ہے وہ علم صحیح نہیں ، دھوکہ ہے اور
اس کا عالم 'عارف' نہیں 'جاہل' ہے !

(3) اگر فطرت انسانی کے متعلق سقراط کی یہ بات صحیح ہے تو ہمیں اس کا
یہ قول ماننا ہی پڑتا ہے کہ "کوئی شخص ارادۃً بد نہیں" کوئی شخص ارادۃً
شر کو اختیار نہیں کرتا اور جب وہ دو برائیوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنے
پر مجبور ہوتا ہے، تو بڑی برائی پر ہاتھ نہیں ڈالتا جب وہ چھوٹی برائی کو
چن سکتا ہے ، اور ہمیں یہ بھی ماننا پڑتا ہے جہل ہی کی وجہ سے
ہم شر کو اختیار کرتے ہیں، گناہ میں پڑتے ہیں لہذا جہل ہی گناہ ہے، بدی
ہے ، جہل سے مراد یہاں عدم علم نہیں بلکہ سفاہت یا حماقت ہے، اس
لئے جاہل ایک معنی میں عالم کہلایا جا سکتا ہے، لیکن ہر معنی میں وہ احمق
ضرور ہے، عوام جنہیں اپنی رائے میں عالم قرار دیتے ہیں وہ حقیقی معنی
میں سفیہ یا احمق قطعاً ہوتے ہیں، وہ خیر کی ماہیت سے جاہل ہوتے ہیں

اپنے نفع وضرر سے بے خبر ہوتے ہیں، وہ اشیاء کے بطون سے واقف نہیں ہوتے، وہ مظاہر کے حسی علم میں گرفتار ہوتے ہیں، وہ اصل میں سرتا خواب ہوتے ہیں، لیکن خواب میں اپنے کو بیدار سمجھتے ہیں، ۶

خفتۂ دائم خویش را بیدار می بیند بہ خواب (صائب)

جذبات سے زیادہ جہل کی صورت کوئی اور شئے نہیں، ارسطو نے سقراط کے اس قول پر جو تنقید کی ہے اس سے یہی ثابت ہوتا ہے، ارسطو کی رائے میں انسان کے اکثر اعمال پر جذبات کی حکمرانی ہوتی ہے، ان کی محرک شہوتیں ہوتی ہیں، عقل یا علم صحیح نہیں، عمل جذبات کے تابع ہوتا ہے (۱۵) اور جذبات ارسطو کے الفاظ میں "روح کا غیر عقلی حصہ ہوتے ہیں" سقراط کا عمل اس کی عقل کا تابع تھا، اس نے خیال کیا کہ ہر شخص کا عمل اسی طرح عقل کا تابع ہوتا ہے، اسی لئے اس نے نیکی کو علم قرار دیا، لیکن روح انسانی کے غیر عقلی حصے، جذبات، اپنی قوت وشدت کے لحاظ سے سرو افگن ہوتے ہیں، اور انہی کا تسلط انسان کے دل ودماغ پر ہوتا ہے، یہ عقل وحکمت سے بے بہرہ ہوتے ہیں، ان کا پیدا کردہ عمل بھی علم اور نیکی سے عاری ہوتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ انسان راہ مستقیم کو جاننے کے باوجود بھی جذبات کے زیر اثر گمراہی اختیار کرتا ہے، ہاتھ میں شمع رکھنے کے باوجود چاہ میں گر جاتا ہے، وہ اعلیٰ مثل دار ہے" چار پائے بر و کتابے چند" کا مصداق ہے، زبان سنت میں " علیم باللسان" اور " جاہل بالقلب" ہوتا ہے اس کے وجود ہی سے حافظ کی یہ مشکل پیدا ہوئی تھی ۔

مشکلے دارم ز دانشمند مجلس باز پرس   توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر می کنند

ارسطو کی اس تنقید سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ نیکی محض علم ہی نہیں ہر عالم ہر صالح نہیں، علم کے باوجود انسان کا نیک کردار بن جانا ضروری نہیں جذبات اس راہ کے مزاحم ہیں ؎

میان بلبل و پروانہ فرق بسیار است   کجا بہ رتبۂ کردار می رسد گفتار

١٥ سقراط کا یہ کہنا صحیح ہے کہ علم یا بصیرت نیکی کے لئے لازمی، ضروری ہے، اس کے بغیر نیکی کی راہ نہیں ملتی، لیکن ارسطو کہتا ہے کہ محض علم ہی کافی نہیں ارادہ بھی ضروری ہے، علم کا استعمال ہونا چاہئے اس کے لئے مجاہدہ کی ضرورت ہے، مجاہدہ سے عمل آسان ہوتا ہے، عمل کی تکرار سے عادت قائم ہوتی ہے عمدہ عادتوں کے قیام ہی سے انسان نیک بنتا ہے، اسی لئے کہا گیا ہے کہ ؎

چند روزے جہد کن باقی بخند !

ارسطو کی تنقید لاجواب نظر آتی ہے، لیکن سقراط کی بات پر غور کرو، شاید بالآخر تم اسی کی بات سے اتفاق کروگے، تم کہتے ہو کہ عالم بے عمل کا وجود اس بات کی دلیل ہے کہ محض علم نیکی نہیں جس کا دعویٰ سقراط کرتا ہے، انسان کو علم و یقین ایک بات کا ہوتا ہے اور وہ عمل اس کے خلاف کرتا ہے ۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس کا یہ علم و یقین کس پایہ کا ہے، کیا تم سمجھتے ہو کہ جو لوگ دوسروں کو ترک دنیا کا سبق دیتے ہیں اور خود سیم و غلہ جمع کرتے ہیں[1] ترک دنیا کے قائل ہیں

---

[1] ترک دنیا بہ مردم آموزند   خویشتن سیم و غلہ اندوزند

اس پر یقین رکھتے ان کا قلب اس کی صداقت پر گواہی دیتا ہے، وہ خود بھی شاید یہ سمجھتے ہیں کہ انہیں اس پر یقین ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ انہیں یقین صرف اسی چیز کا ہے جس پر وہ عمل کر رہے ہیں، اگر انہیں روحانی اقدار کی حقیقی قیمت کا یقین ہوتا تو وہ قطعی اس کی تلاش کرتے اور حطام دنیوی کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے، انسان کی فطرت ہی میں یہ داخل ہے کہ وہ اپنا بھلا چاہتا ہے، فائدہ کی تلاش کرتا ہے اور نقصان یا ضرر سے بھاگتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ آگ پر انگلی رکھنے سے شدت کی سوزش ہوتی ہے، اس لئے میں آگ کے قریب نہیں جاتا، اگر اسی قسم کا یقین مجھے ہو جائے کہ آخرت قابل ترجیح ہے، کیونکہ یہی باقی رہنے والی ہے تو پھر میرے لئے یہ ناممکن ہے کہ میں آخرت کی پروا نہ کروں، اور "محبہ ستورۂ دنیا" کی نازبرداری کرتا رہوں، جیساکہ ہم نے اوپر وضاحت کی ہے، جہل یعنی صحیح علم ویقین کے فقدان ہی سے شر کا ارتکاب عمل میں آتا ہے، الغرض بہر حال یہ نفسیاتی قانون صحیح ہے ۱۵ کہ "عمل تابع حال ہوتا ہے اور حال تابع علم ویقین" لہذا عمل ہی سے حال ویقین ظاہر ہوتے ہیں، کسی شخص کے یقین کا پتہ چلانا ہو تو اس کا عمل دیکھا جانا چاہیئے نہ کہ محض قول، خود اس شخص کو اپنے یقین کی کیفیت اس کے اپنے عمل ہی سے معلوم ہوتی ہے، نفس کے دھوکوں کا حال عمل کے واسطہ سے ظاہر ہو جاتا ہے اور حال قابل اعتبار ہے نہ کہ قال، کردار پر تعمیر ہوتا ہے نہ کہ محض گفتار پر۔

قدم باید اندر طریقت نہ دم ۔ کہ اصلے ندارد دم بے قدم

غرض یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ ہر شخص اپنے علم و یقین کے مطابق ہی عمل کر رہا ہے تو سقراط کی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ نیکی علم صحیح کا نام ہے، علم صحیح قطعاً عمل صالح پیدا کرتا ہے، انسان کو اپنے فائدہ کا علم اور اس پر یقین ہونے کے بعد اس کو اختیار کئے بغیر وہ رہ نہیں سکتا، کیونکہ اس کی فطرت ہی ایسی بنی ہے کہ وہ خیر کی طرف راغب ہوتا ہے، بشرطیکہ اس کو خیر کا علم ہو جائے اور خیر ہی کے علم کو صحیح معنیٰ میں "علم" کہا جا سکتا ہے اور بقائے حق ہی سے دیدۂ بینا حاصل ہوتا ہے ؎

دیدۂ بینا از بقائے حق شود
حق کجا ہمراہ ہر احمق شود

(رومیؒ)

اب ہم تھوڑی دیر کے لئے "حکمت یونانیاں" سے حکمت ایمانیاں کی طرف رجوع کرتے ہیں، نورِ عقل و حس کو نورِ حق سے زینت بخشتے ہیں۔

نورِ حس را نورِ حق تزئیں بود
معنی نورٌ علی نور ایں بود

(رومیؒ)

نیکی علم ہے، کیونکہ علم کی اصل "خشیۃ اللہ[1]" ہے (خوفِ خدا ہے) اِنَّمَا یَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ (پ ۲۲ ع ۱۹) خدا سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں، اس لئے ابن مسعودؓ نے کہا ہے کہ کفیٰ بخشیۃ اللہ علماء و کفیٰ بالاعتزار باللہ جہلاً۔ جب علم خوفِ خدا کا نام ہو

---

[1] امام احمدؒ نے مسروقؒ سے نقل کیا ہے۔

کثرتِ روایت کا نہیں، معلومات کا ذخیرہ جمع کرنے کا نہیں (السیں العلم بکثرۃ الروایت ولکن العلم الخشیۃ) تو ایسا علم قطعاً عمل کو درست کردیتا ہے، یعنی اس سے نیکی پیدا ہوتی ہے، انسان صالح بن جاتا ہے اور اسی معنیٰ میں کہا جاسکتا ہے کہ نیکی علم ہے، اور عالم وہی ہے جو خدا سے ڈرتا ہے اور جاہل وہی ہے جو اس کی نافرمانی کرتا ہے من خشی اللہ فھو عالم ومن عصاہ فھو جاھلٌ، اس بناء پر ہم ہر کتاب خواں وکتاب دان کو عالم نہیں کہہ سکتے، امام شعبیؒ اپنے وقت کے علماء سے کہا کرتے تھے کہ تم عالم نہیں، "ستلذذ بالمسائل" ہو

سائل سے بحث میں تمہیں لذت ملتی ہے، اور یہی لذت تمہاری غایت ہے، عالم سے مراد عالم باللہ فی اللہ عارف باللہ ہے، یعنی عالم وہ ہے جو عرفانِ حق وخوفِ خدا رکھنے کی وجہ سے اللہ ہی کے لئے عمل کرتا ہے اور عمل کا مقصود اللہ ہی کی رضا ومحبت کو قرار دیتا ہے

اسی علم کو زبانِ سنّت میں "علم نافع" کہا گیا ہے اور اس کی وضاحت کی گئی ہے، یہ علم ایک نور ہے جو عالم کے حجابات کو رفع کرتا ہے۔ اور اس کو عرفانِ حق عطا کرتا ہے اسی علم کی وجہ سے وہ اپنے رب کی طرف راہ یاب ہوتا ہے اور اس کو پہچان کر اس سے مانوس ہوجاتا ہے، اس کو اپنے سے قریب بلکہ "اقرب" پاتا ہے، اس کو حاضر وناظر جانتا ہے۔ اس باعثِ قرب کی وجہ سے عالم کا انس اللہ سے بڑھتا جاتا ہے۔ اب اس کو ذکر میں لطف، دعا میں حلاوت، مناجات میں لذّت، ادائے فرضِ عبودیّت

میں سرور و مسرت حاصل ہوتی ہے۔ اب اس کا مقصود حق تعالیٰ ہو جاتے ہیں، جان و مال، فرزند و زن سے وہ زیادہ عزیز و محبوب بن جاتے ہیں اور وہ انہیں مخاطب کر کے کہتا ہے :-

خواہم کہ ہمیشہ در ہوائے تو زیم　　خاکے شوم و زیر پائے تو زیم

مقصود من خستہ ز کونین توئی　　از بہر تو میرم و برائے تو زیم

(سحابی استر آبادی)

جب یہ تعلق عبد میں اور اس کے رب میں پیدا ہو جاتا ہے اور اس طرح جان پہچان ہو جاتی ہے تو حق تعالیٰ اس کے لئے کافی ہو جاتے ہیں، کفیٰ باللہ وکیلاً، جو کچھ وہ مانگتا ہے اس کو ملتا ہے، جو کچھ وہ چاہتا ہے اس کو دیا جاتا ہے اور وہ چاہتا وہی ہے جس میں ان کی رضا ہوتی ہے رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ہر شئے کا عوض حق تعالیٰ ہیں لیکن ان کا عوض کوئی شئے نہیں -

لکل شیئ اذا فارقته عوض　　ولیس للہ ان فارقت من عوض [2]

عارف رومیؒ نے اسی مطلب کو اپنے سریلے نغموں میں یوں ادا کیا ہے کہ جب بندہ کو اپنے بادشاہ سے انس پیدا ہو جاتا ہے تو پھر سارے درد و غم کا علاج مل جاتا ہے اور اس کی طرف رُخ کر کے

---

[2] ہر چیز کا جو تجھ سے جاتی رہے بدلہ ہے لیکن اگر اللہ تعالیٰ سے جاتا رہے تو اس کا کوئی بدل نہیں

لئن سألنی لاعطینہ ولئن استعاذنی لاعیذنہ -

وہ سارے جہان سے فارغ ہو جاتا ہے۔

آنکہ شد انسش بہ شاہ فرد خویش — یافت در ناہائے جملہ درد خویش
چوں اناں اقبال شیریں شد دہاں — سر و شد برآدمی ملک جہاں!

جس کو یہ علم نافع عطا ہوتا ہے اس کو مزید تین چیزیں دی جاتی ہیں قلب خاشع، نفس قانع اور دعائے مسموع۔ جب اصل علم خشیۃ اللہ ہے تو علم کے ساتھ ہی خدا کا خوف بھی عالم کے قلب میں پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کا نفس دنیا سے سیر ہو جاتا ہے، وہ طالب دنیا نہیں رہتا، وہ طالب علو و رفعت نہیں ہوتا، وہ اپنی شہرت کا خواہاں نہیں رہتا۔ اس کو دولت و ثروت کی ہوس نہیں رہتی، وہ ہمعصروں اور دوستوں میں بلندی کی تمنا نہیں رکھتا، اس کو مجلسوں میں ہاتھوں ہاتھ لیے جانے کی آرزو نہیں رہتی (امام سفیان ثوریؒ) امام حسنؓ کے الفاظ میں وہ "زاهد فی الدنیا، راغب فی الآخرة بصیر بدینه، مواظب علی عبادة ربه" ہوتا ہے یعنی دنیا میں زہد اختیار کرتا ہے، آخرت کی طرف راغب ہوتا ہے، اپنے دین میں بصیرت رکھتا ہے اور اپنے رب کا عبادت گزار بندہ ہے۔ دوسری روایت میں اسکی تعریف یوں کی گئی ہے الذی لا یحسد من فوقه ولا یحقر من دونه ولا یأخذ علی علم علمه الله یعنی وہ اپنے سے بڑے پر حسد نہیں کرتا اور اپنے سے چھوٹے کا تمسخر نہیں کرتا اور اس علم کی وجہ سے جو اس کو اللہ نے سکھلایا ہے اس کا مواخذہ نہیں ہوتا۔ جوں جوں اس کا علم زیادہ ہوتا جاتا، اللہ سے اس کا خوف، تواضع اور انکسار زیادہ ہوتا جاتا ہے (اهل العلم

النافع کلما ازدادوا من ھذا العلم ازدادوا للّٰہ تواضعا وخشیۃ و انکسارا وذلًّا (رواہ ابن عمرو) عالم میں خاک کی طرح تحمّل، ذل وافتقار پیدا ہو جاتا ہے، کبر و تحفز و رعونت کا نشان بھی باقی نہیں رہتا ؎

در خاکِ بیلقاں برسیدم بہ عابدے گفتم مرا بہ تربیت از جہل پاک کن
گفتا برو چو خاک تحمل کن اے فقیہ یا ہرچہ خواندۂ در زیرِ خاک کن

علم نافع کا حامل اس فقر الی اللّٰہ کی وجہ سے سارے عالم سے غنی ہوتا ہے، وہ "غنی بالشئ" نہیں، وہ "غنی عن الشئ" ہوتا ہے، اس کا برگ و ساز قرآن عظیم ہے، اس کا قلب سوز و ساز، ذوق و شوق، تسلیم و رضا سے معلوم ہوتا ہے، وہ سراپا صدق و اخلاص و نیاز ہوتا ہے، اس کے فقر کا کچھ حال اقبال کی زبانی سنو،

چیست فقر اے بندگانِ آب و گل؟ یک نگاہ راہ بین یک زندہ دل
فقر کارِ خویش را سنجیدن است بر دو حرفِ لا الٰہ پیچیدن است
فقر خیبر گیر با نانِ شعیر! بستۂ فتراکِ او سلطان و میر
فقر ذوق و شوق و تسلیم و رضاست ما امینیم ایں متاعِ مصطفیٰ است
فقر بر کرّوبیاں شبخون زند بر نوامیسِ جہاں شبخون زند
برگ و ساز او قرآنِ عظیم مرد درویشے نہ گنجد در گلیم

غرض وہ علم نیکی ہے جس کی اصل خشیۃ اللّٰہ ہے جو اپنے حامل میں قلب خاشع النفس قانع پیدا کرتا ہے اور اس کی وجہ سے دعا مسموع حاصل

ہوتی ہے، اور جس شخص سے یہ علم نافع فوت ہو جاتا ہے وہ ان آفات میں مبتلا ہو جاتا ہے جن سے پیغمبر اسلام (روحی فداہ) نے پناہ مانگی تھی یعنی یہ علم اس پر وبال و حجت ہو جاتا ہے" اپنے علم سے وہ کوئی نفع نہیں پاتا" اس کا دل اپنے رب کے لیئے نہ خشوع اختیار کرتا ہے" اور نہ اس کا نفس دنیا سے سیر ہوتا ہے اور نہ اس کی دعا سنی جاتی ہے" یہ علم نہیں جہل ہے اور تمام بدیوں کا مبداء ، ہمیں اس عارف کی تلاش ہے جو اپنی شمع سے محفل کو روشن کردے اور ہمارے قلب سے کانٹوں کو نکال کر اس کو گلشن بنادے ؎

عارف دل و جان تو حسین سازد خارے کہ کند بجاش گلشن سازد

کامل ہمہ را ز نقص بروں آرد

یک شمع ہزار شمع روشن سازد

(قادری ہندوستانی)

استعمالِ اُصولِ موضوعہ

سیرت سازی[1]

شنیدست کسے کہ تخت عاجے دارد   تاآنکہ نہ شاہانہ مزاجے دارد
یعنی کہ خروس پیش ارباب شعور   سلطان نشود اگرچہ تاجے دارد

(درد)

۲ دنیا کی سب سے زیادہ خوبصورت شئے، سب سے زیادہ گراں قدر اور عزیز شئے پاک سیرت ہے، زندگی تربیت گاہ ہے، حق تعالیٰ مربّی و معلم ہیں، واقعات و حادثات وہ آلات و ادوات ہیں، جن کے ذریعہ وہ ہماری سیرت کی تکمیل کر رہے ہیں، دنیا کی "روح سازی" وادی میں کبھی غم کے مضراب سے اور کبھی خوشی کے تاروں سے سیرت ہی کے نغمے بیدار کئے جاتے ہیں، زندگی کی غایت ہمیں یہ نظر آتی ہے کہ سیرت کو سنوارا جائے، پختہ کیا جائے، کامل بنایا جائے، کیوں؟ اس لئے کہ سیرت ہی پر دنیوی کامیابی کا انحصار ہے، سیرت ہی پر فوز آخرت کا مدار ہے، دین و

---

[1] یہ مقالہ معارف میں مارچ سنہ ۱۹۴۲ء اول مرتبہ شائع ہوا۔

دنیا کی اصلاح سیرت ہی کی اصلاح سے ہو سکتی ہے، سیرت ہی پر جسمانی اور روحانی صحت مبنی ہوتی ہے اور برد قلبی اور طمانیت خاطر پاک سیرت ہی کا نتیجہ ہے! بنی آدم کا "اکرام" سیرت ہی کی پاکی کی وجہ سے ہوتا ہے، جو انسان پاک سیرت نہیں وہ صورۃً گو انسان ہے، لیکن حقیقۃً وہ حیوان ہے، یا دیو ہے یا غول ہے، "شیاطین الانس" میں اس کا شمار ہے، وہ دنیا، دین اور آخرت کی حقیقی اقدار سے محروم ہے!

سیرت، علمائے نفسیات کی باریک بین اور دور رس نگاہ میں ان تنقیات، عادات و میلانات کا مجموعہ ہے جو فرد کے کردار کی رہنمائی کرتا ہے، اس کو دوسروں سے متمیز کرتا ہے اور اس کی وحدت کردار کا باعث ہے، ہر فرد دوسرے فرد سے متمیز ہوتا ہے، صورت اور سیرت میں صورت کی غیریت تو حقیقی واقعی ہوتی ہے، یہ رفع نہیں کی جا سکتی، اور نہ کوئی اس کو رفع کرنا چاہتا ہے، لیکن سیرت میں ایک قسم کی مماثلت ہو سکتی ہے، یہ مماثلت عینیت نہیں انفرادیت نا قابلِ ازالہ ہے باوجود مماثلت کے انفرادیت موجود ہوتی ہے، اور اس انفرادیت کا میلان اور اس کے وہ اقتضایات و مطالبات ہیں جو اپنا ظہور عادات و افعال میں کرتے ہیں اور اس تمام مجموعہ کو ہم نفسیات کی اصطلاح میں سیرت سے تعبیر کرتے ہیں، سیرت افعال میں وحدت پیدا کرتی ہے اور سیرت کے کامل علم کے بعد بڑی حد تک فرد کے افعال کی پیش گوئی ممکن ہو جاتی ہے۔

۱۔ سیرت کی تحلیل میں ہمیں اس امر کا خیال رکھنا چاہیئے کہ عادات کی

تنظیم کا نام ہے، عادت کی تشکیل افعال کی تکرار سے ہوتی ہے، افعال کا صدور بظاہر محرکات پر مبنی ہوتا ہے۔ لیکن محرکات کا ماخذ ومنبع وہ تیقنات و اذعانات ہوتے ہیں، جو انسان زندگی کے تجربات، ماحول کے اثرات، تعلیم اور دوسرے ذرائع سے حاصل کرتا ہے۔ علم ویقین، عمل و عادات پر وہ اہم عناصر ہیں، جن میں سیرت کی تحلیل کی جا سکتی ہے۔ سیرت سازی کے طریقے کو جاننے کے لئے ہمیں ان کی عناصر کی تحقیق کرنی ہوگی۔

(۱) علم و یقین العلم نکتۃ، سیرت سازی کے لئے صرف ایک نکتہ کا وجدانی اجمالی علم کافی ہے، پھر عقلی طور پر اس کی تفصیل و توضیح میں دفاتر رنگے جا سکتے ہیں ؎

دل گفت مرا علم لدنی ہوس است	تعلیم کن گرت بدیں دسترس است
گفتم کہ الف، دگر گفتم ہیچ	در خانہ اگر کس است یکحرف بس است

(شیخ عزیز الدین محمود الکاشی)

وہ وجدانی علم، علم لدنی حق تعالیٰ کی الوہیت کا اقرار ہے، اسی اقرار کی مضبوط چٹان پر سیرت کی مشید عمارت تعمیر کی جا سکتی ہے، اس اقرار کے تضمنات پر غور کرو، جب میں ایمان و اذعان کی تمام تر قوت سے حق تعالیٰ کے الٰہ ہونے کا اقرار کرتا ہوں تو سب سے پہلے میں یہ مان رہا ہوں کہ حق تعالیٰ ہی معبود ہیں، وہی عبادت یا پرستش کے قابل ہیں۔ عبادت کیا ہے، یہ نہایت تذلل کا نام ہے، اظہار ذلت کا نام ہے میرا یہ سر اگر جھک سکتا ہے۔ تو بس میرے خالق، میرے مولیٰ، میرے مالک ہی کے سامنے جھک سکتا ہے

اور غیر کے سامنے ہرگز نہیں جھک سکتا! اظہارِ ذلّت کی وجہ کیا ہے؟ میں
فقیر ہوں، محتاج ہوں، میرا معبود غنی ہے، قوت و اقتدار سے متصّف ہے،
علم و حکمت سے موصوف ہے، رب ہے، پالنے والا ہے، مستعان ہے،
مدد کرنے والا، استعانت ہی کی خاطر میں اس کے سامنے اظہار ذلت
کرتا ہوں اور جانتا ہوں کہ سارا عالم فقیر ہے، اور میرا معبود ہی صرف غنی
و حمید ہے، میں اس کا فقیر ہو کر سارے عالم سے غنی ہوں، میرا یہ احساس
کہ میں اس شہنشاہ کا دریوزہ گر ہوں، جس کے دریوزہ گر سارے شاہ و
گدا ہیں، مجھے سارے عالم سے بے نیاز کر دیتا ہے اور میں کفیٰ باللہ
وکیلا کہہ کر عبادت و استعانت کے نقطۂ نظر سے ماسوی اللہ سے کٹ
جاتا ہوں، اور فقر و ذلت یا بندگی کی نسبت اللہ ہی سے جوڑ لیتا ہوں،
اب کائنات کی بڑی سے بڑی قوت بھی میرے لیے نہ امیدوں کا مرکز
بن سکتی ہے اور نہ خوف و ہراس کا سبب، ان سب کا فقر، ان سب کی
ذلت و مجبوری، بیچارگی و بے بسی میری نظروں میں اتنی آشکارا و ہویدا
ہو جاتی ہے، جتنی کہ خود میری بیکسی و مجبوری، ہم سب عبد ہیں، کوئی چیز
اصالۃً ہماری نہیں، فقر ہماری ذاتی صفت ہے، امانۃً چند روز کے لیے
چند چیزیں ہم کو دی جاتی ہیں، نادانی سے ہم ان کو اپنی سمجھتے ہیں، حقیقی
مالک کو بھول جاتے ہیں، انہی کی محبت میں فریفتہ ہو جاتے ہیں، حقیقی
اقتدار سے غافل ہو جاتے ہیں، ناگہاں یہ طلسم ٹوٹ جاتا، اور یہ ساری
محبوب و مرغوب چیزیں موت ہم سے چھین لیتی ہے، اور پھر اپنے اصلی

فقر و ذلت کے ساتھ ہم نادم و پشیمان اس جہان سے رخصت ہو جاتے ہیں تاکہ اپنے اعمال کے اثرات کو، اپنے افعال کے نتائج کو، اپنے کردار کے اثمار و عواقب کو جو اس دنیا میں بھی اپنی موجودگی کا مختلف رنگوں میں ہمیں احساس بخش رہے تھے، زیادہ نمایاں، زیادہ واضح اور اجاگر طریقہ سے دیکھیں، اور حسرت و ندامت کی آگ میں جلیں۔

سیرت کی تعمیر اسی اساسی یقین پر ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ ہی مسجود ہیں، جن کے آگے یہ سیر اسر جو سارے جہان کے مقابلہ میں معزز و مفتخر بلند و بالا ہے۔ فقیرانہ شان سے جھک رہا ہے، اور حیات و علم، رزق و فراخی، صحت و عزت، ہدایت و رشد کی استدعا کر رہا ہے، اور غیر متزلزل یقین کے ساتھ کر رہا ہے کہ حواس کی آنکھ چاہے جو تماشا دکھلائے، اور وہم چاہے جو بنالے اور منوالے، یہ ساری نعمتیں حق تعالیٰ ہی دے سکتے اور دیتے ہیں، ان کے سوا نہ کسی میں حول و قوت ہے، اور نہ فعل واثر وما بکم من نعمة فمن الله۔ صورتوں سے جو ہم نے امیدوں باندھ رکھی ہیں، صورتوں کو جو ہم نے خوف کی چیزیں سمجھ رکھی ہیں، صورتوں کے سامنے جو ہم ذلت کا اظہار کر رہے ہیں، اور صورتوں کے سامنے ہاتھ پھیلا رہے ہیں اور ان کو رب بنا رکھا ہے، یہ کس قدر عظیم الشان دھوکا ہے، اس کے ضرر و اضلال کا پہلو کس قدر قوی ہے، عزت نفس کی خونریزی کو دیکھو، اپنی ذلت و رسوائی کو دیکھو، اس کذب و افترا کے نتائج پر غور کرو، فقیروں کے در پر سوال کرنے سے بھی کچھ ملا ہے، اس غریب کے ہاں کیا رکھا ہے؟

جو دوسروں کو دے، امیدوں کا خون ہونا لازمی ہے، حسرت وحرمان قلبی، جو بیچارہ اپنے درد دکھ کو دفع نہ کرسکتا ہو، وہ تمہارے درد و غم کا کیا علاج کرسکتا ہے، وہ تمہارا مولیٰ، وہ رب کیسے ہو سکتا ہے! ہائے تم نے حقیقت کو چھوڑ کر سایہ کا تعاقب شروع کردیا ہے، بیدار کو چھوڑ کر مدہوش سے التجا کر رہے ہو، زندے کو چھوڑ کر مردے سے لپٹے ہوئے ہو! تمہارے وہم نے تمہیں کس التباس میں مبتلا کر رکھا ہے!

بقول، دشمن پیمان دوست بشکستی
ببیں کہ از کہ بریدی و با کہ پیوستی

معبود ومستعان صرف حق تعالیٰ ہی ہیں، ذل و افتقار کی نسبت ان ہی سے ہمیں جوڑنا چاہیئے، وہی ہماری امیدوں کے مرکز ہیں، ان ہی کی ناراضی سے ہمیں خوف کرنا چاہیئے، ان چوب وسنگ یا گوشت پوست کے جھوٹے خداؤں سے بندگی کی نسبت قطعاً توڑ لینی چاہیئے، ان سے نفع و ضرر کی توقع قطعاً چھوڑ دینی چاہیئے۔

تا چند گہ از چوب گہ از سنگ تراشی
بگذر از خدائے کہ بصد رنگ تراشی

حق تعالیٰ کی معبودیت و ربوبیت پر یہ یقین، یہ ایمان سیرت کا سنگِ بنیاد ہے! اسی یقین کی پرورش ہونی چاہیئے الٰہ باطلہ کی نفی، الٰہ حق کا اثبات قلب کی گہرائیوں میں متمکن ہو جائے، تحت الشعور نفس میں جاگزیں ہو، رگوں میں خون کی طرح دوڑ جائے، علم الیقین کے مرتبہ سے گزر کر حق الیقین

کے درجہ تک پہنچ جائے، متحقق ہو جائے تو پھر ایسی شخصیت کی تخلیق ہوتی ہے جس کا مقابلہ کائنات کی کوئی قوت نہیں کر سکتی وہ بفحوائے تخلقوا باخلاق اللہ خلقِ الٰہی سے مزیّن ہوتا ہے، تمام صفاتِ رذیلہ سے پاک اور تمام اوصافِ حمیدہ سے آراستہ و پیراستہ ہوتا ہے، کامل عبد ہوتا ہے جس سے بہتر، جس سے زیادہ مقدس دنیا میں کوئی شئے نہیں ہوتی!

توحید معبودیت کی رو سے حق تعالیٰ ہی مالک و حاکم قرار پاتے ہیں، اور مستحق عبادت ٹھیرتے ہیں، ہمارا سر حقیقی مالک و حاکم ہی کے سامنے جھکتا ہے، جس کے آگے ساری کائنات سرنگوں ہے، طوعًا و کرہًا" اور توحید ربوبیت کی رو سے حقیقی فاعل حق تعالیٰ ہی قرار پاتے ہیں، وہی خالق ہیں وہی نافع و ضار ہیں، وہی زندہ کرتے ہیں اور مارتے ہیں، ہمارا ہاتھ ان ہی کے آگے دراز ہوتا ہے اور انہی سے ہم مدد و اعانت کے لیے درخواست کرتے ہیں! غنی کی فقیری ہمیں ساری کائنات سے بے نیاز اور غنی کر دیتی ہے

دیکھو توحید معبودیت اور ربوبیت کا سبق دے کر عرب کے امیؐ معلم (فداہ ابی و امی) نے اپنے متبعین کو صفاتِ رذیلہ سے کس طرح پاک اور صفاتِ حمیدہ سے کس طرح مزین کر دیا تھا! صفاتِ رذیلہ جس سے تمام علمائے اخلاق قلوب کا تزکیہ چاہتے ہیں، اس رباعی میں یوں ادا کئے گئے ہیں :—

خواہی کہ دلت شود صاف چو آئینہ	دہ چیز برون کن از درون سینہ
حرص و حسد و بخل و حرام و غیبت	کذب و غضب و کبر و ریا و کینہ

دیکھو ان صفاتِ قبیحہ سے قلب کا تزکیہ سقراط کے "نظریات" افلاطون کے "مکالمات" ارسطو کی "اخلاقیات" اور جدید فلسفیوں کے عالمانہ "خطبات" کے بغیر پڑھے اور سمجھے صرف لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے مختصر جملہ کو ماننے اور اس پر عمل پیرا ہونے سے کس آسانی سے ہو جاتا ہے۔

جب تک انسان دولت کو اپنی ملک سمجھتا ہے، خود ہی کو اس کا مالک جانتا ہے، نہ حرص کا اس کے قلب سے تسلّط اٹھ سکتا ہے اور نہ بخل و حسد کا جوں ہی اُس نے سچے دل سے توحید فی الآثار کا اقرار کیا اور یہ مان لیا کہ للہ ما فی السمٰوٰت وما فی الارض وما بینھما، اللہ ہی کے لئے ہے جو کچھ آسمان اور زمین اور ان کے درمیان جو کچھ ہے تو اس نے اپنی مالکیت و حاکمیت کی نفی کی اور حق تعالیٰ کی مالکیت و حاکمیت کا اثبات کیا، حقیقی مالک و حاکم و متصرّف حق تعالیٰ کو جانا، اور اپنی ذات کو محض "امین" سمجھا اب اس کی سمجھ میں یہ بھی آگیا کہ حقیقی مالک ہی کو تصرّف کا حق حاصل ہوتا ہے۔ امین امانت کے شرائط کے تحت ہی تصرّف کا اختیار رکھتا ہے، اب اگر دولت پر جو اس وقت اس کی امانت میں ہے، کوئی آفت آجاتی ہے تو وہ بحیثیت امین اس کو بچانے کی حتی الامکان کوشش کرتا ہے اگر بچ نہ سکے تو جانتا ہے کہ مالکِ حقیقی امانت کا استرداد چاہتا ہے اور بخوشی وہ اپنی امانت حوالہ کر دیتا ہے، اس طرح نہ اس کے جانے کا اس کو رنج ہوتا ہے اور نہ اس کے آنے کی خوشی، اور اس کا قلب ان اختلال پیدا کرنے والے تاثرات سے پاک اور آزاد رہتا ہے، اور وہ

یک دل داری بس است یک دوست ترا

کہ کر حق تعالیٰ ہی کو اپنا محبوب قرار دیتا ہے اور ایک دم رنج و غم، پریشانی و پشیمانی کے تمام احساسات و جذبات سے حقیقی معنی میں نجات حاصل کر لیتا ہے، ایسے ہی خوش قسمت کی ذہنیت کو ان الفاظ میں پیش کیا گیا ہے ۔

(۱) لکیلا تاسوا علی ما فاتکم — تاکہ تم غم نہ کھاؤ اس پر جو ہاتھ
ولا تفرحوا بما اٰتاکم — نہ آیا اور شیخی نہ کرو اس پر جو
(پ ۲۷ ع ۱۹) — تم کو اس نے دیا

ان اصول کو سمجھ لینے کے بعد غور کرو کہ وہ شخص حریص کیسے ہو سکتا ہے جو مال و دولت کا حقیقی مالک حق تعالیٰ کو سمجھتا ہے اور ان احمقوں کو جو اپنی ذات کو مالک سمجھ رہے ہیں مخاطب کر کے کہتا ہے ۔

گماں مبر کہ زر و سیم دادہ اند ترا — ودیعت است کہ داری بدست روزے چند
چہ سود گر بشوی غرہ بر متاع کسے — چو موش بر سر دکان روستا فرسند

حرص کے ساتھ بخل و حسد کی بھی جڑیں کٹ جاتی ہیں، جب مال و دولت ودیعت و امانت ہیں، اور وہ بھی چند روزہ امانت اور قریب ہی ہم سے واپس لے لی ہیں اور دوسروں کے حوالہ کی جاتی ہیں تو پھر اس علم کے بعد ہماری ذہنیت اس چوہیا کی طرح کیسے رہ سکتی ہے جو بنئے کی دکان کی ساری چیزوں کو اپنی سمجھتی ہے اور اپنے ہی کو مالک و متصرف جان کر بخل و حرص کا شکار بنتی ہے، غیر کے مال میں بخل بے معنی ہے ۔ بخل ہوتا ہے اپنے مال میں، مال اپنا نہیں، پھر بخل کیسا ؟ حرص کی بنیاد بھی اس خیال پر

قائم ہے کہ مالک ہم ہیں، حقدار ہم ہیں ہم کو نہیں مل رہا ہے، دوسروں کو مل رہا ہے، ہم کو کیوں نہ ملے، جب مال میرا ہے نہ تیرا بلکہ مالک حقیقی کا تو حسد کس پر؟ حسد و حرص اور ان کے لازمی نتائج ہم و غم، درد و حزن، رنج و الم نتیجہ ہیں خیانت فی الامانت کا، یعنی شرک کا، جوں ہی شرک کی جڑیں قلب سے لاالہ الا اللہ کے ذریعہ اکھاڑ کر پھینک دی گئیں اور اس کی بجائے توحید جلوہ افروز ہوگئی، انسان ان تباہ کن جذبات کے چنگل سے نجات پا جاتا ہے، حقیقی آزادی کا لطف اٹھاتا ہے، سکون و برد قلبی کی دولت سے سرفراز کیا جاتا ہے۔

کبر و فخر و عجب کی اس قلب میں گنجائش ہی کہاں جو اپنے کو حاکم نہیں محکوم، مالک نہیں مملوک، رب نہیں مربوب، مولیٰ نہیں عبد سمجھتا ہو، اپنی محکومیت و مملوکیت کا یقین جو موحد کے دل کی گہرائیوں میں جا گزیں ہے، فخر و غرور کے جذبات کو پیدا ہونے نہیں دیتا۔ اس کی عضویت اس زہر کو قبول کرنے کی صلاحیت یا استعداد ہی نہیں رکھتی۔

اب توحید فی الربوبیت کے قیام کے آثار پر غور کرو جب تم نے فاعل حقیقی حق تعالیٰ کو مان لیا، لاحول ولا قوۃ الا باللہ کے قائل ہوگئے نافع و ضار فی الحقیقت انہی کو سمجھنے لگے تو خوف و حزن سے تم نے رستگاری حاصل کر لی۔ غیر کو نافع و ضار قرار دینے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ تم کو اس سے نفع پہنچنے کی امید ہوتی ہے۔ اور اس امید کی شکست حزن و غم کو ضروری طور پر پیدا کرتی ہے۔ اس سے ضرر کا اندیشہ تمہارے سینہ کو

خوف سے بھر دیتا ہے، جونہی تم نے وہم کے اس بت کو توڑا اور حق تعالےٰ کی اس تنبیہ کو یاد کیا کہ،

ولا تدع من دون اللہ — اللہ کے سوا کسی کو مت پکارا ایسے

ما لا ینفعک ولا یضرک — کو نہ بھلا کرسکے تیرا اور نہ بُرا،

فان فعلت فانک اذاً من — پھر اگر تُو ایسا کرے تو تو ہوجائے

الظّٰلمین (پ ۱۱ ع ۱۲) — ظالموں میں۔

غیر اللہ کی ربوبیت تمہارے قلب سے فنا ہوگئی، نفع کی امید، ضرر کا خوف تمہارے سینہ سے جاتا رہا اور حزن وخوف سے تم نے ہمیشہ کے لیئے نجات پائی۔

ان الذین قالوا ربنا اللہ — مقرر جنہوں نے کہا کہ رب ہمارا

ثم استقاموا فلا خوف — اللہ ہے ! پھر ثابت قدم رہے

علیہم ولا ہم یحزنون — تو نہ ڈر ہے ان پر اور نہ وہ غمگیں

(پ ۲۶ ع ۲) — ہوں گے۔

ربوبیت پر جہاں تم نے استقامت پیدا کرلی کردیا اور زندگی کے متعلق تمہارا سارا نقطۂ نظر بدل گیا، نقطۂ نظر کا بدلنا تھا کہ زمین وآسمان بدل گئے، ؎

چوں برخیزد خیال از چشم احول
زمین وآسمان گردد مبدّل

ایک وہم تھا، خیال تھا، جس نے تمہیں خوف وحزن کی زنجیروں میں

جکڑ رکھا تھا، اب تم نے اس خیال کی تصحیح کی، ذہنی صحت تمہیں حاصل ہوئی، نور کی طرف تم نے اپنا منہ کر لیا، اور تمہاری روح اپنے خالق و حاکم کو مخاطب کر کے چیخ اٹھی،

اَللّٰھُمَّ اسلمت نفسی الیک	اے اللہ میں نے اپنی جان تیرے سپرد کی
ووجہت وجھی الیکَ	اپنا منہ تیری طرف کیا، اپنے کام تیرے
وفوضت امری الیکَ	حوالہ کئے، اپنی پیٹھ تیرے سامنے
والجات ظھری الیک رغبةً	جھکائی، تیرے فضل کی امید میں اور
ورھبة الیکَ لاملجاء ولا	تیری ناراضی سے ڈر کر، میری پناہ اور
منجاء منک الیکَ۔[1]	نجات کا مرکز تو ہی ہے۔

اس اقرار ربوبیت کے ساتھ ہی تم نے اپنے قلب میں طمانیت و راحت محسوس کی، اعتماد و یقین نے خفتہ قوتوں کو جگایا، سارا عالم تمہیں نفع و ضرر سے خالی، تمہارے ساتھ تعاون عمل کے لیئے تیار، تمہارا رفیق و خادم نظر آنے لگا! زندگی کے راستہ میں تمہارے قدم بے باک انداز میں اٹھنے لگے، تمہارا سینہ کینہ سے پاک ہو گیا، کیونکہ تمہارا یہ وہم دور ہو گیا کہ سوائے حق تعالیٰ کے ضرر اور نقصان پہنچانے والا درحقیقت دوسرا کوئی ہو سکتا ہے، جو اس کی آنکھ جس کو دشمن بے رحم دیکھ رہی تھی، ایمان کی آنکھ کو حق تعالیٰ کا فرستادہ بتلا رہی ہے اور

---

[1] یہ اس حدیث کے الفاظ ہیں جو صحاح ستہ میں موجود ہے رواہ الجماعة عن البراء بن عازب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سونے کے وقت آخری چیز یہ پڑھتے تھے۔

سعدی رح کے پر اثر الفاظ میں کہہ رہی ہے ؎

چوں دشمن بے رحم فرستادۂ اوست
بدعہد اگر شوم ازیں دشمن دوست

اسی وقت غیظ و غضب سے بھی تمہارا نفس پاک ہوگیا، دوست پر غضب کیسا؟ اس یقین کے بعد کہ ہر آفت، ہر مصیبت سیرت کے کسی نقص کو رفع کرنے آتی ہے، معلّم حقیقی کی طرف سے ایک تنبیہ ہے جو ہمیں اپنے نقائص و ذمائم کی طرف متوجہ کرتی ہے، ان کی اصلاح کا موقع دیتی ہے، ہم کو ظلمت سے نکالتی اور نور کی طرف ہمارا رُخ پھیر دیتی ہے، ہمارا رشتہ حق تعالیٰ سے جوڑتی اور نفس و شیطان سے توڑتی ہے، ہاں پھر اس یقین و ادعان کے بعد ہمارا سینہ غیظ و غضب کا محل کیسے بن سکتا ہے۔

ریا جو خلق کے لئے اپنے اعمال کی تزئین ہے، اسی وقت ممکن ہے جب خلق کو نافع و ضار سمجھا جائے، خلق سے توقعات وابستہ ہوں، یا ضرر کا اندیشہ ہو، اس وہم کے دور ہو جانے کے ساتھ ہی ریاکاری اور تصنّع و نمائش کی جڑیں کٹ جاتی ہیں، عمل صرف حق تعالیٰ ہی کے لئے خالص ہو جاتا ہے، جود و تقصور کے لئے نہیں رہتا، کیونکہ یہ بھی مخلوق ہیں اور مخلوق سے نہ راحت ہے اور نہ سرور و عزت اور نہ یہ مقصود بالذات۔

کذب یا دروغ بافی کا محرک یا تو نفع کا حصول ہوتا ہے، یا ضرر کے دفع کا خیال، یا پھر خود بینی و خود ستائی، کبر، فخر، عجب و ریا، ہم نے اوپر لکھا کہ معیت حق ان صفات ذمیمہ کا استیصال کس خوبی سے کر سکتی ہے، اسی لئے

موحد کا قلب صداقت کا خزینہ ہوتا ہے، وہ وعدوں کا پکا، قول کا سچا ہوتا ہے والموفون بعهدهم اذا عاهدوا[1]، کا مصداق۔

اسی طرح غیبت شرک فی الربوبیت کا نتیجہ ہے غیبت کی وجہ یا تو عداوت ہوتی ہے جس کا محرک نقصان وضرر کا اندیشہ ہوتا ہے، یا حسد یا محض کذب سے حاصل ہونے والی شیطانی لذت، ربوبیت کا صحیح علم اور اس پر یقین، ان تمام ذمائم کی بے خطا دوا ہے جیسا کہ ہم نے اُوپر ثابت کیا، غیر اللہ کو حقیقی نافع وضار قرار دے کر عداوت وبغض وحسد میں مبتلا ہوں، اور غیبت نتیجہ کے طور پر پیدا ہوتی ہے، خود آفریدہ البّاس کو صحت علمی نے دفع کر دیا اور ان ذمائم کی گرفت سے قلب کو نجات ملی۔

غرض تزکیۂ نفس وتصفیۂ قلب یعنی سیرت سازی کے لئے سب سے پہلے شرک فی المعبودیت اور شرک فی الربوبیت کی بیخ کنی ضروری ہے لا کی شمشیر سے مالکیت حاکمیت اور ربوبیت ذوات خلق سے کاٹ دی جاتی ہے اور الّا سے اس کا اثبات ذاتِ حق میں کیا جاتا ہے اور اس طرح اخلاق الٰہیہ سے آراستہ ہونے کی قابلیت اور استعداد پیدا کی جاتی ہے اب مجاہدہ اور عمل اس مقصود کے حصول کے لئے ضروری ہیں، اس کی توضیح میں چند مقامات کا پیش نظر رہنا لازمی ہے۔

ابتدا میں ہم نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ علم ہی سے عمل پیدا ہوتا ہے لیکن

---

[1] پورا کرنے والے اپنے اقرار کو جب عہد کریں۔

علم سے مراد محض نظری علم نہیں لینا چاہیئے۔ جو کانوں کی راہ سے داخل ہوتا ہے، لیکن قلب میں جاگزین نہیں ہوتا، اس لیئے عمل کی صورت میں نمایاں ہونیکی قوت نہیں رکھتا اور اس لیئے منفعت بخش نہیں ہوتا[1] علم سے ہماری مراد وہ یقین و اذعان ہے، جو قلب کی گہرائیوں میں اپنا مسکن بناتا ہے، خون کی طرح تمام رگوں میں دوڑتا ہے، دماغ پر کامل تسلط رکھتا ہے، اور لازماً عمل کی صورت میں نمودار ہوتا ہے، ایسا یقین تفکر و تدبر یا مراقبہ سے پیدا ہوتا ہے، اسی لیئے تفکر[3] کو عبادت سے افضل قرار دیا گیا[2] ہے، تفکر و مراقبہ سے علم راسخ ہوتا ہے مضبوط ہوتا ہے، تلوین جاتی ہے، تمکین رونما ہوتی ہے اور راسخ عقیدہ ہی عملاً اپنا خارج میں ظہور کرتا ہے جب عمل کی تکرار ہوتی ہے، تو عادت پیدا ہو جاتی ہے، جو فطرت ثانیہ کہلاتی ہے، اب عمل کے لیئے فکر و غور کی ضرورت باقی نہیں رہتی، غیر شعوری نفس عمل کی باگ اپنے ہاتھوں میں لے لیتا ہے مغالفت رفع ہو جاتی ہے، سہولت پیدا ہو جاتی ہے، سیرت قائم ہو جاتی ہے اسی لئے کہا گیا ہے

چند روز جہد کن باقی بخند

---

[1] ایسے علم سے استعاذہ کیا گیا ہے۔ اعوذ بك من علم لا ینفع و من قلب لا یخشع۔

[2] تفکر ساعة، خیر من عبادة سبعین سنة (الدیلمی ورد ی ابو الشیخ من حدیث ابو ہریرہ)

[3] قل انی اعظکم بواحدة ان تقوموا للّٰہ مثنٰی و فرادٰی ثم تتفکروا پ ۲۲ ع ۱۲ سے تفکر کا حکم صاف طور پر سمجھ میں آتا ہے۔

اب ہمیں سیرت سازی کے دوسرے اہم عنصر مجاہدہ یا عمل و عادت کی طرف توجّہ کرنی چاہیئے،

(۲) مجاهده، پاک سیرت جس طرح بغیر صحیح علم اور عقیدہ کے ممکن نہیں اسی طرح بغیر عمل صالح اور مجاہدہ کے اس کی تمام خوبیوں کا نمایاں ہونا بھی ممکن نہیں، اسی لیئے فرمایا گیا: ۔ جاھدوا فی اللہ حق جھادہ[1] اور صحیح عقیدہ و مجاہدہ ہی کی چشم بصیرت افروز کے سامنے نیکیوں کی تمام راہیں کھول دی جاتی ہیں والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا[2]۔ اب ہمیں مجاہدہ کی ماہیت اور اس کے طریقوں کو سمجھ لینا چاہیئے۔

ذرا اپنے ذہن کے تہ خانہ کو تو دیکھو کہ کیا یہ ایک لحظ خیالات، تصورات خواطر اور وساوس سے خالی بھی رہتا ہے، علم کا ایک دریا ہے، امڈا چلا آرہا ہو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک لا متناہی مبداء سے نکل رہا ہے، اس کی ماہیت و نوعیت پر غور کرو تو ظاہر ہوتا ہے کہ اخلاقی نقطۂ نظر سے یہ یا تو ہدایتی علم ہے یا ضلالی، اس کی آمد کسی طریقہ سے روکی نہیں جاسکتی، کونسی قوت اس کو روک سکتی ہے؟ کسی خیال کو محض ارادہ کی قوت سے پیدا ہونے دینا بشری طاقت سے باہر ہے، خیالات آزادی کے ساتھ ایک نامعلوم منبع سے ظہور کرتے ہیں، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان نہ ان کے پیدا کرنے پر

---

[1] مجاہدہ کرو اللہ کے واسطے جیسا کہ چاہیئے اس کے واسطے مجاہدہ کرنا (پ ۱۷ ع ۱۷)

[2] جنہوں نے ہمارے واسطے مجاہدہ کیا ہم ان کو اپنی راہیں سمجھا دیں گے (پ ۲۱ ع ۲۲)

قادر ہے اور نہ اُن کے فنا کرنے پر! لیکن انسان کو اتنی طاقت دی گئی ہے کہ اپنی توجّہ اضلالی علم کی طرف سے ہٹا کر ہدائیتی علم کی طرف مبذول کر دے، یا نفسیاتی اصطلاح میں یوں کہو کہ سلبی خیالات کو ایجابی خیالات میں بدل دے، یہی مجاہدہ کی ماہیت ہے، ذہن میں سلبی یا اضلالی خیال غیر اختیاری و اضطراری طور پر پیدا ہو رہا ہے اب یہ میرے اختیار میں ہے کہ میں اس خیال کو گلے سے لگاؤں، پیار کروں، قلب کے میدان میں تخت بچھا دوں اور اس کو معزز مہمان کی طرح عزت و وقار سے بٹھا دوں، یا یہ کہ اس کے ذہن کے دروازے سے سر نکالتے ہی اس کے مقابل ہدایتی یا ایجابی خیال کو اس کی سرکوبی کے لئے لے آؤں، نور کی قوت کو ظلمت کی طاقت سے لڑا دوں، ظاہر ہے کہ نور و ظلمت کے مقابلے میں نور ہی کامیاب ہوگا کیونکہ ظلمت نور کے غیاب کا تو نام ہے، نور ہی کے عدم سے ظلمت پیدا ہوتی ہے، جہاں نور ہو وہاں ظلمت کیسے چھا سکتی ہے! مجاہدہ حق تعالیٰ ہی کی حول و قوت سے اضلالی علم کے بجائے ہدائیتی علم پر عمل کرنے کا نام ہے، اضلالی خیالات کے ذہن میں خطور کرتے ہی مجاہدہ کی رُوح خیر کے مبدأ کی طرف استعانت کے لئے متوجّہ ہو جاتی ہے، استعاذہ کرتی ہے، پناہ مانگتی ہے، اپنی محدود قوت پر بھروسہ نہیں کرتی، اپنی بیچارگی سے واقف ہوتی ہے، لامتناہی قوت کے آستان پر تیزی کے ساتھ پہنچ جاتی ہے اور چیخ اٹھتی ہے۔

سبحان ذی الملک والملکوت سبحان ذی العزۃ والعظمۃ والجبروت

سبحان الحی الذی لا یموت اعوذ بعفوک من عقابک واعوذ برضاک
من سخطک واعوذ بک منک جل وجہک[1]

اور یہ متناہی عزت و جبروت' یہ لا محدود ملک و ملکوت والا آقا ہم سے دور نہیں' وہ جو بالذات ہے جہاں میں موجود ہر جگہ" ہمارے پاس ہی تو ہے رگِ جان سے زیادہ قریب ہے ' یا اڈنا نزدیک تر' وہ الغیاث' کی اس پکار پر شانِ رحمت کے ساتھ متوجہ ہو جاتا ہے' اور اس کی تجلّی کے ساتھ ہی قلب کے غرور و اضلال سے پوری حفاظت ہو جاتی ہے! یا نفسیاتی اصطلاح میں یوں کہو کہ سلبی خیال کی جگہ ایجابی خیال لے لیتا ہے ' اور شر کا صدور ہی نہیں ہونے پاتا'

نفسیات کے اس مسلّمہ قانون کو یاد کرو' جس پر اس مقالہ کی بنیاد قائم ہے کہ افکار ہی سے اعمال کا صدور ہوتا ہے' اعمال ہی کی تکرار سے عادت کا قیام ممکن ہے' اور عادات کی تنظیم و ترتیب سے سیرت کی تشکیل ہوتی ہے مجاہدہ سلبی یا بد یا اضلالی خیالات کا گویا دو دوانہ ہی پر مقابلہ ہے' جونہی ان خیالات نے کتمِ عدم سے سر نکالا ' ان کے مقابل کے ایجابی یا نیک یا ہدایتی خیالات نے ان سے ٹکّر لی' اپنی محدود کمزور قوت سے ان کا مقابلہ نہیں کیا' بلکہ نا متناہی قوت و جبروت کے مبداء سے اخذ فیض کیا اور اسطرح بے پناہ طاقت کے ساتھ ان پر ضرب لگا دی اور ان کا قلع قمع کر دیا ' جب

---

[1] یہ اس حدیث کے الفاظ ہیں جن کو حاکم نے حضرت عمرؓ سے روایت کیا ہے۔

عمل ہی کا صدور اس طرح روک دیا گیا، اور ابتدا ہی میں روک دیا گیا تو تکرار کی نوبت ہی کہاں، عادت کا قیام کس طرح ممکن اور سیرت بد کی تشکیل کا کیا ذکر، یاد رکھو کہ فاسد خیالات کو قوت اس وقت ملتی ہے، جب وہ تخیل کے دروازے سے خانۂ قلب میں داخل ہو جاتے ہیں، اور یہ داخل اسی وقت ہو سکتے ہیں، جب دربانِ قلب غفلت کی نیند سو رہا ہو، چوکس نہ ہو، ہوشیار اور خبردار نہ ہو، یا پھر اپنی حول و قوت سے ان کا مقابلہ کرنا چاہے! اس صورت میں معلوم ہوتا ہے کہ ان کا زور مردافگن ہے، ان سے مقابلہ بچوں کا کھیل نہیں، یہ بڑے سے بڑے پہلوان کو آسانی سے پچھاڑ سکتے ہیں، ان کے داؤں پیچ سے بہادر سے بہادر بھی پناہ مانگتے ہیں، ان سے مقابلہ کی ایک ہی صورت ہے، ان کے ورود کے وقت ہی انہیں پچھاڑا جائے، سنبھلنے کا موقع نہ دیا جائے اور حق تعالیٰ کی حول و قوت سے ان کا سامنا کیا جائے اللّٰھم اعذنی من شر نفسی[1] کی فریاد فوراً بلند ہو، اعوذ بک منک کی چیخ فوراً نکلے، پھر شکست ناممکن ہے، کامیابی قطعی ہے حق تعالیٰ کی پناہ میں آکر مغلوبیت کیا معنی رکھتی ہے، ناکامی کیا چیز ہے، ان کی معیت کے ساتھ ہی بلندی نصیب ہوتی ہے، انتم الاعلون و اللّٰہ معکم[2] کا وعدہ پورا ہو جاتا ہے۔

---

[1] اے اللہ میرے نفس کے شر سے مجھ کو پناہ دے

[2] تم ہی رہو گے غالب اور اللہ تمہارے ساتھ ہے (پ ۲۶ ع ۸)

یہی نفسیاتی الہیاتی طریقہ بدعادت کی شکست میں بھی کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جا سکتا ہے، بدعادت سے مراد کوئی عادت ہے، جو ہمارے اختیار و تصرّف میں نہیں، بدعادت کی غلامی تباہ کن نتائج پیدا کرتی ہے بدعادت کا غلام دنیا میں نہ کامیاب ہو سکتا ہے اور نہ بدقلبی اس کو نصیب ہو سکتی ہے۔ چونکہ افعال ہی کی تکرار سے عادت بنتی ہے اور افعال کا محرک ہمیشہ خیال یا تصوّر ہوتا ہے۔ لہٰذا بدعادت کی شکست خیال کی تبدیلی پر منحصر ہے، عادت کے قائم ہو جانے پر فعل کے ارتکاب کی ایک طبعی خواہش ہوتی ہے لیکن ساتھ ہی اس خواہش کی تکمیل کا خیال پیدا ہو جاتا ہے، ممکن ہے کہ خواہش پر ہمارا قابو نہ ہو لیکن خیال ہمارے تصرّف میں آ سکتا ہے، اگر خیال کا صحیح طریقہ سے مقابلہ کر لیا جائے تو خواہش بھی مغلوب ہو جاتی ہے، مثال کے طور پر شرابی کی حالت پر غور کرو، اس کو شراب کی خواہش ہوتی ہے، اور یہ خواہش یہ خیال پیدا کرتی ہے کہ چل کر پینا چاہیئے، خیال کا کامیابی سے مقابلہ کرنے پر خواہش کے اشتداد میں کمی ہوتی جاتی ہے، ایک مرتبہ کا مقابلہ دوسرے دفعہ کے مقابلہ کو آسان تر بناتا ہے، اور مجموعی نتیجہ حیرت خیز ہوتا ہے، یہی معنی ہیں اس قول کے کہ "خدا ان لوگوں کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں"۔

بہر طور بُری عادتوں کے آہنی نتیجہ سے رہائی اسی وقت ممکن ہے کہ خیال کے پیدا ہوتے ہی اس کا مقابلہ کیا جائے اور اسی طریقہ سے مقابلہ کیا جائے جس کا اوپر ذکر ہوا، اگر اس کے باوجود ہمیں ناکامی کی صورت

دیکھنی پڑے، تو نہیں مایوس اور ناامید نہیں ہونا چاہیئے مجاہد کے نزدیک یاس کفر ہے، گناہ کے ارتکاب کے بعد یا عادت بد کا پھر ایک مرتبہ اعادہ ہو عزم راسخ کے کہ ایسا نہ ہوگا) شکار بننے کے بعد جو ندامت اس کے دل میں پیدا ہوتی ہے، جو حزن و ملال کہ وہ محسوس کرتا ہے، وہ اس کے ارادوں کو مضبوط کرنے میں غیر محسوس طریقہ پر مفید ہوتے ہیں، اور وہ وقت بہت جلد آ پہنچتا ہے، جب وہ محض اسی طریقہ پر عمل پیرا ہو کر ناتوان انسان سے اپنی خود ساختہ بیڑیوں کو توڑ کر ہمیشہ کے لئے آزاد ہو جاتا ہے، عارف رومیؒ نے مجاہدہ کے اس اعتبار کو اپنے خاص انداز میں بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے

اندریں رہ می تراش و می خراش — "تا دم آخر دمے فارغ مباش

"تا دمے آخر دمے آخر بود — کہ عنایت با تو صاحب سر بود

دوست دارد دوست ایں آشفتگی — کوشش بیہودہ بہ از خفتگی

کار کن تو در کاہل مباش — اندک اندک خاک چہ را می تراش

چوں نہ چاہے می کنی ہر روز خاک — عاقبت اندر رسی در آب پاک

چوں نشینی بر سر کوئے کسے — عاقبت بینی تو ہم روئے کسے

بہرحال مجاہد ہمت سے کام لیتا ہے، حق تعالیٰ نے اس کو جو اختیار دے رکھا ہے اس کو استعمال کرتا ہے اور عزم راسخ رکھتا ہے کہ جب تک گوہر مقصود ہاتھ نہ آئے قلب کا تزکیہ روح کا تجلیہ نہ ہو جائے وہ دم نہ لے گا اور حق مجاہدہ ادا کرے گا، ولولہ انگیز طریقہ سے ہر قدم پر وہ گنگناتا جاتا ہے۔

دست از طلب ندارم "تا کار من بر آید — یا تن رسد بجاناں یا جاں ز تن بر آید

کامیابی و فتحمندی اس مجاہد کے ہاتھ چومتی ہے کان حقا علینا نصر المؤمنین کا وعدہ اس سے متعلق ہوتا ہے! ہدایت کے راستے کھل جاتے ہیں لنھدینھم سبلنا کا قول پورا ہوتا ہے

١٥ مجاہدہ بیوی بچّوں کا چھوڑنا، راتوں میں کم سونا، فاقہ پہ فاقہ کرنا، حقوقِ نفس کو تلف کرنے کا نام نہیں، مجاہدہ "حقوقِ نفس" کا ادا اور غیر شرعی "حظوظِ نفس" کا ترک کرنا ہے، مجاہدہ قلب کا تصفیہ ہے، روح کا تجلیہ ہے، اس کا بہترین طریقہ خیالاتِ فاسدہ کا دماغ سے تخلیہ ہے، جو شخص اپنے قلب و دماغ میں فاسد خیالات کے بجائے پاک خیالات کو، سلبی اذکار کے بجائے ایجابی افکار کو جگہ دیتا ہے وہ اعمالِ سیئہ کا دروازہ بند کر دیتا ہے، اس کے لیے امتثالِ امور، اجتناب محظور اور رضا بہ مقدور آسان ہو جاتے ہیں، جو عارفِ اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی رح کے الفاظ میں دین کا خلاصہ ہیں[١]!

ایجابی خیالات میں سب سے زیادہ ایجابی خیال حق تعالیٰ کا خیال ہے جو سرچشمہ ہیں تمام محامد و محاسن کا! تمام خوبیوں اور نیکیوں کا جو مبداء ہیں طمانیت و سرور کا، علو و بلندی کا، قوت و عزم کا، اگر تم اپنے قلب کو تمام سلبی خیالات سے خالی کر کے حق تعالیٰ کے خیال کو اس میں جمانے کی کوشش کرو گے تو چند روز میں پاؤ گے کہ یہ تمام صفاتِ حسنہ پیمانے میں تم میں خود ظاہر ہو رہی ہیں! نفسیات کا یہ عام قانون ہے کہ آدمی جس چیز کے خیال اور

١؎ فتوح الغیب مقالہ اوّل۔

دھن میں رہتا ہے رفتہ رفتہ اسی کی خو بو اس میں پیدا ہونے لگتی ہے یا نفسیاتی زبان میں یوں کہو کہ اس کا جو معروض فکر ہوتا ہے وہی وہ بھی بن جاتا ہے! اس قانون کو جان کر اور مان کر تم ہرگز سلبی خیالات پر فکر و توجہ کو زیادہ مرکوز نہ کرو گے، ایجابی خیالات ہی کو جمانے اور بسانے کی کوشش کرو گے، اب ہم عارف رومؒ کے الفاظ میں پوچھتے ہیں کہ حق تعالیٰ سے بہتر کوئی اور چیز ہو سکتی ہے جس سے تم ایک لحظہ کیلئے حقیقی معنی میں خوش رہ سکتے ہو

کیست زو بہتر بگو اے ہیچ کس
تا بدان دلشاد باشی یک نفس؟

اگر تمہیں چشم بصیرت ملی ہے اور تم عارف روم کے ساتھ اتفاق کرتے ہو تو پھر کیا حق تعالے کی دھن سے بہتر اور کسی کی دھن ہو سکتی ہے؟ اب دن کا زیادہ حصہ اسی دُھن میں گزارو، گفتار کو چھوڑ کر اسی کار بزرگ میں لگ جاؤ، رفتہ رفتہ جامی سامی نے جو کہا تھا اس کا تم کو تحقق ہونے لگے گا ؎

گر در دل تو گل گزرد گل باشی ۔۔۔ ور بلبل بے قرار بلبل باشی
تو جزوی و حق کل است اگر روزے چند ۔۔۔ اندیشۂ کل پیشہ کنی کل باشی

جو چیز تم کو خود تجربہ سے معلوم ہو جائے گی اس کا ذکر کیا کریں، لیکن تحریص کے لئے اتنا کہنا کافی ہے کہ تم پر سرور اور فرح کے دروازے کھل جائیں گے اطمینانِ قلب؛ جو دنیا کی کسی چیز سے حاصل نہیں ہو سکتا، وہ نقد دم ہوگا، اور اس آیۂ کریمہ کا اپنی ذات کو مصداق پاؤ گے۔

یا ایتھا النفس المطمئنہ ۔۔۔ اے وہ جی جس نے چین پکڑ لیا ۔

ارجعی الی ربک راضیۃ — پھر چل اپنے رب کی طرف تو اس سے
مرضیۃ فادخلی فی عبادی — راضی وہ تجھ سے راضی پھر شامل
وادخلی جنتی — ہو میرے بندوں میں اور داخل ہو
(پ ۳۰ ع ۱۴) — میری بہشت میں ۔

نفس مطمئنہ کا حصول، رضائے الہی کا تحقق، جنت ذات میں دخول، یہ نتائج ہیں اس مجاہدہ کی تکمیل کے! جو لذت کہ حق تعالیٰ کی یاد میں ہے، جو مستی اس کی یافت و شہود سے حاصل ہوتی ہے، اس کے مقابلہ میں "لذات جہاں" ہیچ ہیں، جامیؒ اس ذوق و مستی کو اس والہانہ انداز سے ادا فرماتے ہیں

کاسے بلبل جان مست بیاد تو مرا — وے پایۂ غم پست بیاد تو مرا
لذت جہاں را ہمہ در پا فگند — ذوقیکہ دہد دست بیاد تو مرا

حق تعالیٰ کی یاد کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ اس کا ذکر زبان پر جاری ہے فاذکروا اللہ ذکرا کثیرا، پر عمل ہو، اٹھتے بیٹھتے یہی شغل ہو، اس سے مقصود فقط قرب الہی ہو، جب تمہاری توجہ ذکر کی وجہ سے خرافات دنیوی سے ہٹ کر ایک نکتہ پر مرکوز ہوگی، تو خودبخود فاسد، سفلی پریشان کن خیالات اور وساوس کا دروازہ بند ہوجائیگا اور جونہی خیالات کی یہ پراگندگی موقوف ہوئی، ایک روحانی کیف و طمانیت سے تمہارا قلب مملو ہوجائے گا الا بذکر اللہ تطمئن القلوب کے یہی معنی ہیں، ذکر کا قیام مشق اور مجاہدہ سے آہستہ آہستہ ہوتا جاتا ہے، اور ذہول و غفلت کا ارتفاع ہوجاتا ہے اس دولت کے حاصل ہوجانے کے بعد تم تمام چیزوں سے غنی ہوجاتے ہو نہ کسی چیز کے

حصول سے تمہیں لذت ہوتی ہے اور کسی چیز کے ضائع ہونے سے رنج لکیلا
تاسوا علیٰ مَا فاتکم ولا تفرحوا بما آتاکم کے مصداق ہونے لگتے ہو، اللہ کو
سکھ کر تمہیں کسی چیز کی خواہش نہیں رہتی، تم عارف رومؒ کے الفاظ میں کہنے لگتے ہو

روزہا گر رفت گو رو باک نیست　　　تو بماں اے آنکہ جز تو پاک نیست

یاد کے قائم کرنے کا ایک اور آسان گر ہم تمہیں بتلاتے ہیں، یہ تو تم مانتے
ہو کہ ہر شئے کے خالق حق تعالیٰ ہیں، شئے ان کی مخلوق ہے، ہمارا رات دن
سابقہ ان ہی اشیاء سے ہوتا ہے، یہی ہمارے دل اور دماغ میں بسی ہوتی ہیں
ان ہی کی محبت سے ہمارے قلوب بھرے ہوئے ہیں، چونکہ یہ فانی اور
گریز پا ہیں، ان کا زوال اور ان کی فنا پذیری ہمارے غم و حزن کا باعث ہوتی
ہے، اب قانون ائتلاف ذہنی کی رو سے یہ ممکن ہے کہ مخلوق کو دیکھ کر خالق کی
طرف ذہن منتقل ہو جائے، تم یہی کوشش کرتے رہو کہ شئے کو دیکھ کر تمہارا خیال
شئے کے خالق کی طرف جائے، اس طرح تمہیں ہر طرف حق تعالیٰ ہی کا جلوہ نظر آ
نے لگے گا، اور ایسا تو انشاء فثم وجہ اللہ کے معنی کا ابتدائی فہم حاصل ہونے لگیگا
شئے کی سلبی جہت سے توجہ ہٹ کر جہت حق کی طرف مرکوز ہو جائے گی اور
اس طرح یاد قائم ہونے لگے گی، تمہارا معروض فکر اب شئے نہیں حق ہوگا، اور
ان تمام افکار سے تمہارا قلب معمور ہونے لگے گا جو وجہ اللہ کی طرف رخ کرنے
سے حاصل ہوتے ہیں۔

اس طریقہ سے تمہیں بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ سعادت و مسرت کا
سرچشمہ خود تمہارا قلب ہے، حق تعالیٰ کا جلوہ گاہ خود تمہارا قلب ہے آفاق میں

حق تعالیٰ ظاہر ہیں، ہر شئے کے ساتھ بجہت حق موجود ہے، صحیح علم کے استعمال سے وہم اور التباس دور ہوا اور نظر کی اصلاح ہوئی، نقطۂ نظر بدلا، معلوم ہوا کہ انفس و آفاق میں حق تعالیٰ نہاں و عیاں ہیں، انہی سے تعلق قائم کرنا انہی کی یاد کا بجانا تمام مسرتوں اور سعادتوں کو حاصل کرنا ہے، ان سے غفلت اور ذہول اور خلق میں استغراق اور فنائیت تمام بلاؤں اور آفتوں میں گرفتار ہونا ہے، من یعرض عن ذکر ربه سلکه عذابا صعدًا ۔ جو کوئی اپنے رب کی یاد سے منہ موڑتا ہے چڑھتے عذاب میں ڈال دیا جاتا ہے (پ ۲۹ ع ۱۱)

اسی مفہوم کو رومیؒ کے دل نشین الفاظ میں یاد رکھو: ۔

گر گریزی بر امید راحتے   ہم از آنجا پیشت آید آفتے

ہیچ کنجے بے دد و بے دام نیست   جز بخلوت گاہ حق آرام نیست

حق تعالیٰ کو چھوڑ کر خلق میں محویت، خواہ بظاہر وہ کیسی ہی دلفریب اور دل کش نظر کیوں نہ آئے، نور کو چھوڑ کر ظلمت میں گرفتار ہونا ہے اور ظلمت سے ضیق، غم و حزن و خوف کے سوا اور کیا حاصل ہوتا ہے، ظلمت میں چیزیں اپنے صحیح حدود حال میں کہاں نظر آتی ہیں، کسی شئے کا حسن و جمال تاریکی میں کیا دکھائی دے گا! پھر تمہاری نظر میں اشیاء کی یہ دل فریبی تمہارے نفس کا دھوکا ہے، التباس ہے، تمہارا واہمہ بھی تو خلاق ہے کیسی کیسی دلربا صورتیں یہ تمہاری خوشی کے لئے پیدا کرتا ہے، ان سے تمہیں بھی لذت حاصل ہوتی ہے۔ تھوڑی ہی دیر بعد غم کا سایہ تمہارے قلب پر چھا جاتا ہے، ابھی اعتماد ہوتا ہی، ذرا دیر بعد خوف کا زبردست حملہ ہوتا ہے، اور تم کانپ اٹھتے ہو، تمہاری

طبیعت میں استقلال نہیں، استحکام نہیں، تمہاری کوئی پناہ گاہ نہیں! اگر تم اپنی غفلت سے جاگ اٹھو، اگر تمہاری چشم بصیرت کھل جائے اور نور اور صداقت کی دنیا نظر آنے لگے، تو تمہیں اشیاء ویسی ہی دکھائی دینے لگیں گی جیسی کہ وہ ہیں، اب تم کو حیاتِ طیّبہ نصیب ہوگی، اطمینانِ و بے فکری حاصل ہو گی، خوف و حزن زائل ہو جائے گا، استقلال و استحکام عطا ہو گا اور حق تعالیٰ کے اس وعدہ کا ایفا ہو گا۔

من عمل صالحاً من ذکر او	جس نے نیک کام کیا مرد ہو یا عورت
انثی وھو مومن فلنحیینہ	اور وہ ایمان پر ہے تو ہم اس کو زندگی
حیٰوۃ طیبۃ (پ۱۴ ع ۱۹)	دیں گے ایک اچھی زندگی۔

یادِ حق کو قائم کرنے، تمہارا رخ ظلمت سے نور کی طرف پھیرنے، مجاہدہ کے راستہ کو آسان کرنے، خلق سے توڑنے اور حق سے جوڑنے میں نیکوں کی صحبت عجیب و غریب اثر رکھتی ہے، صحبت کا اثر نفسیات کا ایک مسلمہ اصول ہے[1]۔ ہر فرد میں بے سوچے سمجھے ہر قسم کے قضایا کو قبول کرنے کی استعداد یا صلاحیت

---

[1] ومثل جلیس الصالح کمثل صاحب المسک ان لم یصبک منہ شیء اصابک من ریحہ ومثل جلیس السوء کمثل صاحب الکیر ان لم یصبک من سوادہ اصابک من دخانہ (ابوداؤد و نسائی عن انسؓ) نیک ہم نشین کی مثال مشک والے کی سی ہے اگر تجھے اس سے کچھ نہ ملے تو خوشبو تو ضرور پہنچے گی اور برے ہمنشین کی مثال لوہار کی بھٹی کی سی ہے اگر تجھ کو اس کی سیاہی نہ لگے تو دھواں تو ضرور پہنچے گا۔

پائی جاتی ہے، جب یہ قضایا خود اپنے ذہن کے اندر سے وصول ہوتے ہیں تو
اسکو جدید نفسیات کی اصطلاح میں "خود ایمائی" OUTO SUGGESTION کہا جاتا
ہے اور جب کسی خارجی ذریعے سے حاصل ہوں تو "غیر ایمائی" - (HETERO-
SUGGESTION) کہا جاتا ہے "رات دن ہم خود ایمائی اور غیر ایمائی
کے اثر کے تحت خیالات کو قبول کر رہے ہیں، اور ان کو جزو ذہن بنا رہے
ہیں، اگر سلبی یا اضلالی افکار غیر ایمائی قوت کی وجہ سے ہمارے قلب میں
جگہ پا رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم بری صحبت میں ہیں اور ان کے تنفیات
وافعال کی نقل کر رہے ہیں، اور اضطراری طور پر ان سے متاثر ہو رہے ہیں
ان کے سمی اثرات سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم صحبت ناجنس سے
قطعی احتراز کریں ؎

زاحمقاں بگریز چوں عیسیٰ گریخت
صحبت احمق بسے خونہا بریخت

سلبی اثرات سے اس طرح بچ کر ایجابی اور ہدایتی علم کے لئے نیکوں
کی صحبت کی تلاش کرنی چاہیئے۔ اہل اللہ کی زبان سے حاصل کیا ہوا علم
اپنے اندر خاص اثر و قوت رکھتا ہے۔ وہ قلب کی گہرائیوں تک پہنچ جاتا ہے
یقین واذعان کی شکل اختیار کر لیتا ہے، علم حق کو شیخ اکبر محی الدین عربی نے
علمُ اذواق" قرار دیا ہے اور فرماتے ہیں کہ علم الحق علم الاذواق لا
عن الاوراق وھو العلم الصحیح وما عداہ حدث وتخمین لیس العلم
اصلاً۔ "یعنی علم ذوق و وجدان سے حاصل شدہ علم ہے۔ محض کتابوں سے

حاصل کردہ نہیں، اور یہی علم صحیح ہے۔ باقی الکل پچر مطلق علم نہیں، شاید اس کا مطلب یہ ہے کہ اہل اللہ کا علم قیاسی نہیں، مبدء نبوت سے اخذ کردہ ہے، قطعی، یقینی ہے، حقیقی، واقعی ہے، اس کو قبول کرنے اور اس پر عمل کرنے سے حق تعالیٰ خود ان کے معلّم ہو گئے ہیں، اور اب وہ براہ راست اسی مبدا سے علم حاصل کرنے لگے ہیں۔ اتقوا اللہ ویعلمکم اللہ[1] اس پر دلیل ہے، اسی لئے ایک دوسرے رازدان کی نصیحت ہے، کہ خذ العلم بافواہ رجال اللہ ولا من الصحائف والدفاتر۔ مردان حق کی زبان سے علم حاصل کرو، کتابوں اور دفتروں سے نہیں، کیونکہ ان کتابوں میں قیاس و تخمین، ظن و رائے کے سوا کیا رکھا ہے،

4 اہل اللہ کی صحبت خاک کو کیمیا کرتی ہے، ان کے افعال و اعمال، ان کے افکار و خیالات رفتہ رفتہ قلوب کے زنگ کو دھوتے جاتے ہیں، اور تم غیر شعوری طور پر نیکی کی طرف مائل ہوتے جاتے ہو اور بدی سے مجتنب اور محترز اور بالآخر ظلمت سے نکل کر نور کی طرف تمہارا سفر ہو جاتا ہے، عارف روم نے صحبت مردان حق کے اثرات کو یوں بیان فرمایا ہے۔

خواہی کہ دریں زمانہ فردے گردی　　　　یا در رہ دیں صاحب دردے گردی

ایں را بجز از صحبت مردان مطلب　　　　مردے گردی چو گرد مردے گردی

یہ کونوا مع الصادقین کے حکم کے پنہاں فائدوں کی اجمالی توضیح ہے۔ سیرت سازی کے قرآنی اصول کی اوپر جو توضیح پیش کی گئی، اس کو اجمالاً

---

[1] اللہ سے ڈرو وہ تمہیں علم دیتے ہیں۔

ایک دفعہ پھر دہرا لیجئے، اذ انکر وتفقد تکرار سے چیزیں زیادہ دلنشین ہوتی ہیں، سیرت کی عمارت کا سنگ زاویہ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰه پر پختہ یقین واذعان ہے تمام انبیاء کا اپنی قوم کو یہی پیغام تھا کہ یاقوم اعبدوا الله مالکم من إله غیرہٗ، اے قوم اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود و رب نہیں، اللہ ہی لائق عبادت ہیں، استعانت انہی سے کی جانی چاہیئے، سر انہی کے سامنے جھک سکتا ہے، غیر کے سامنے نہیں، اس بنیادی عقیدہ کا زبان سے اقرار ضروری ہے، زبان سے بار بار کی تکرار یقین کو پختہ کرتی ہے، جس قدر یقین میں پختگی ہوگی، اسی قدر عمل میں سہولت ہوگی، یقین میں شدت پیدا کرنے کے لیے غور و تکر اور مراقبہ ضروری ہیں، یقین اس شدت کا پیدا ہو جائے کہ شک و شبہ کی مطلقاً گنجائش نہ رہے، تم جانتے ہو کہ آگ میں ہاتھ ڈالنے سے تمہارا ہاتھ جل جائے گا، اسی طرح تمہیں توحید فی المعبودیت وتوحید فی الربوبیت کا یقین ہو جانا چاہیئے، ذلت (جو عبادت کی اصل ہے) حق تعالیٰ ہی کے سامنے اس کا ظہور ہو سکتا ہے، جو ہمارے مالک ہیں، حاکم ہیں، مولیٰ ہیں، خالق ہیں، رب ہیں، وکیل و نصیر ہیں، حق تعالیٰ ہی نافع و ضار ہیں، معز و مذل ہیں، حاجت و مراد سوا ان کے کوئی پوری نہیں کر سکتا، اسی لیے انہی کے سامنے دست سوال دراز ہو سکتا ہے، کسی اور کے سامنے ہرگز نہیں، زبان پر یہ دعا جاری ہے، اور قلب میں اس کا مفہوم متمکن،

اللهم كما صنت وجوهنا	الٰہی جس طرح تو نے ہمارے
ان تسجد لغيرك فصن	چہروں کو غیر کے آگے سجدہ

ایدنات تمنع بالسؤال لغیرکَ — کرنے سے بچایا اسی طرح ہمارے ہاتھوں کو اپنے غیر کے آگے سوال کرنے سے بچالے۔

اس عقیدہ اوریقین کا شخص اپنے ہم جنسوں کے آگے کیسے خود کو ذلیل کرسکتا ہے، اس کی سیرت غلاموں کی سی کیسے ہوسکتی ہے، وہ نفع و ضرر کی توقع غیر اللہ سے کب رکھ سکتا ہے، اور اپنی عزت اس وہمی نفع ونقصان کی خاطر کیسے بیچ سکتا ہے، مجاہدہ اساسی کو پختہ کرتا ہے اس کا طریقہ یہ ہے کہ خاطر کی نگہبانی کی جائے، سلبی اور اضلالی علم کو ایجابی وہدایتی علم سے بدلا جائے، قانون "تقطیب اذکار" "LAW OF THE POLARISATION OF THOUGHT" نفسیات کا ایک مسلّمہ قانون ہے، اسی قانون کے استعمال سے اضلالی علم ہدایتی علم میں تبدّل کیا جاتا ہے، نہ صرف یہ بلکہ ایجابی خیالات ہدایتی اذکار کو ذہن میں ہمیشہ جمانے کی کوشش کرنی چاہیے، اور سب سے زیادہ ایجابی خیال حق تعالیٰ کا خیال ہے، جب یہ قلب پر چھا جاتا ہے، تو قلب تمام ظلمتوں سے پاک ہوجاتا ہے، نورانی ہوجاتا ہے، نور ہوجاتا ہے اللھم اجعل فی نفسی نورًا اللّٰھم اجعلنی نورًا۔ کی دعا قبول ہوجاتی ہے اس کا نتیجہ سرور و طمانیّت ہے مسرّت وسعادت ہے جو پاک سیرت کی لازمی خصوصیت ہے، نیک سیرت شخص مسرور و مطمئن ہوتا ہے، اس کی جان اس کا تن راحت میں ہوتا ہے وہ نظرۂ نور ہوتا ہے، غم سے فارغ اور دائمًا مسرور ہوتا ہے، یہ

روحانی مسرت ہے، جو طبعی غم و حزن میں باقی رہ سکتی ہے۔ الا ان اولیاء اللہ لاخوف علیہم ولاھم یحزنون، الذین اٰمنوا وکانوا یتقون لھم البشریٰ فی الحیوٰۃ الدنیا و فی الاخرۃ لاتبدیل لکلمات اللہ ذلک ھو الفوز العظیم (پ ۱۱۔ ع ۱۱)

تصحیح فکر[1]

اے برادر تو ہمیں اندیشۂ — مابقی تو استخوان و ریشۂ

گر گل است اندیشۂ تو گلشنی — ور بود خارے تو ہیمہ گلخنی

(رومیؒ)

افکار و خیالات ہی سے مقاصد و غایات کا تعین ہوتا ہے، مقاصد کردار، افعال و اعمال میں ظہور پذیر ہوتے ہیں، افعال ہی کی تکرار سے عادت قائم ہوتی ہے، عادات کی تنظیم و ترتیب سے سیرت تشکیل پاتی ہے اور سیرت ہی ہماری قسمت کا تعین کرتی ہے، جیسی سیرت ویسی قسمت، لہذا جیسے خیالات ویسی کائنات، انا عند ظن عبدی بی۔

یہ قانون ذہن کے دائرہ میں وہی صداقت و اہمیت رکھتا ہے جو قانون تجاذب دائرہ فطرت میں، قطعی و یقینی، جب سیرت اور قسمت کی تشکیل و

---

[1] یہ مقالہ "بزم فلسفہ" کی کرسی نشینی کے موقع پر سنایا گیا، جو جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کے شعبہ فلسفہ کی بزم مباحثہ ہے۔ معارف اپریل ۴۵ء میں شائع ہوا۔

تعیین میں افکار و خیالات ہی کی کار فرمائی ہے۔ تو ظاہر ہے کہ ہر شخص کیلئے اپنے افکار و خیالات کی اصلاح اس کا اپنا نہایت اہم فریضہ ہے، قوم سازی اور فرد کی روح کی تکمیل اصلاح خیال پر منحصر ہے۔ ع

یک تنقیہ دماغ می باید کرد

مقاصد و غایات کا دائرہ ذہن انسانی ہے، انسان کا کوئی فعل مصلحت و غایت سے خالی نہیں ہوتا، اب مقاصد کا تعین غور و فکر سوچ اور بچار پر منحصر ہے، فکر ہی کائنات کی سب سے زیادہ عظیم الشان قوت ہے اور یہی ان دونوں انسان میں سب سے زیادہ غیر ترتیب یافتہ قوت ہے، اس کی تربیت ہی کے متعلق مجھے یہاں کچھ کہنا ہے۔

فرض کیجئے کہ آپ کو ایک باغ لگانا ہے، اس کے لئے آپ کو چند قوانین پر عمل کرنا ہوگا، جن کو باغبانی کے قوانین سے تعبیر کیا جاتا ہے، سب سے پہلی چیز تو یہ دریافت کرنی ہے کہ باغ لگایا کہاں جائے، پھر اس جگہ کو مسطح اور خس و خاشاک سے پاک کرنا ہوگا، یہ چیز سب سے زیادہ اہم ہے، پھر ہمیں پھولوں یا ترکاریوں کے بیج کا انتخاب کرنا چاہیئے، اور اس عمدگی سے تیار کی ہوئی زمین میں انہیں بونا چاہیئے۔ ہمیں اس امر کا بھی خیال رہے کہ بیج عمدہ ہیں، ناقص نہیں، پھر موسم گرما میں ان بیجوں کو پانی دینا پڑتا ہے تاکہ شدت تمازت انہیں جلا نہ ڈالے، اب ہمیں انتظار کرنا پڑتا ہے کہ وقت مقررہ گزر جائے اور بالآخر گل تر رونما ہو جائے، اگر بے صبری سے ہم بیجوں کو کھود کر دیکھنا چاہیں کہ یہ جل تو نہیں گئے، تو پھر ان بیجوں کو نشو و نما کا

موقع نہیں ملے گا، بعض دفعہ ہمیں کچھ زیادہ دن انتظار کرنا پڑتا ہے، لیکن اگر ہم نے خس و خاشاک سے اچھی طرح پاک کیا ہے، بیجوں کے انتخاب میں غلطی نہیں کی، آبیاری کی ہے، تو ہمیں یقین ہے کہ ایک دن زندگی دامن زمین چیر کر پتیوں کی شکل میں جلوہ افروز ہوگی، اسی زمانے میں ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ باد و باران، آفتاب و حرارت بیجوں کے نشو و نما کے لیئے ضروری ہے، طوفان تک انہیں نقصان نہیں پہنچا سکتے، عناصر ان کے دشمن نہیں، ساری کائنات اور کائنات کی ساری قوتیں ان کے ساتھ اشتراک عمل کر رہی ہیں۔

فرض کرو کہ انتظار کی مدت بحمد اللہ گزر گئی، بار یک بیجوں نے خوش رنگ و دلفریب لالہ و یاسمین کی شکل اختیار کی، فطرت کا زبردست لیکن مانوس معجزہ ہماری آنکھوں کے سامنے پیش ہوا، شروع ہی سے ہم جانتے ہیں اور یہ علم مرتبۂ یقین تک پہنچا ہے کہ جس پھول کا بیج ہم نے بویا ہے، وہی پھول والا پودا رونما ہوتا ہے، اور ہزاروں باریکیوں کے ساتھ اپنے اندر ان تمام چیزوں کا اعادہ کرتا ہے جو اس پودے میں پائی جاتی ہیں، جس کا یہ بیج ہے کیا اس بیج کو اصلی پھول کی نہ بھولنے والی صورت یاد رہتی ہے؟

پھول کی غایتِ تخلیق سے تو ہم واقف نہیں، لیکن اتنا ضرور جانتے ہیں۔ کہ یہ ہمارے دل کا سرور آنکھوں کا نور ہے، کسی کے پاکیزہ الفاظ میں ہم اس کو "ربیع قلبی، نور بصری، جلاء حزنی، ذہاب ہمّی" کہہ سکتے ہیں!

باغبانی کے یہ قواعد تو آپ سب جانتے ہیں، کوئی نئی بات نہیں، لیکن میری دانست میں نئی بات جو آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ

بالکل انہی قواعد و قوانین کے استعمال و پابندی سے آپ دنیا کی تمام حسین و خوشگوار چیزوں کو حاصل کر سکتے ہیں، جو زندگی کے بیج میں مستور ہے اور ہی ہم میں سے ہر ایک میں موجود ہے۔ ان چیزوں کے حصول کے لئے ہمیں زندگی کی ویسی ہی خدمت کرنی پڑتی ہے جیسی کہ ان پھولوں کے بیجوں کی ہم نے کی تھی۔

دلفریب پھولوں کے لئے آپ نے خارج (عالم اکبر) میں باغ لگایا تھا۔ شادمانی و مسرت کے حصول کے لئے آپ کو باطن (عالم اصغر) میں باغ کے لئے زمین تیار کرنی ہے، شاید آپ کو علم نہیں کہ اس کا محل و قوع ٹھیک کہاں ہے؟ یہ باغ آپ کو اپنے "میدانِ فکر" میں لگانا ہے، کیا آپ کو یہ معلوم ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کے ہاں ایک عظیم الشان میدانِ فکر موجود ہے۔ جس کی وسعت کو ارض و سما نہیں پا سکتے، صرف ہمارا دل ہی اس کو سما سکتا ہے، افسوس ہے کہ یہ میدان خس و خاشاک سے پٹا پڑا ہے، جانتے ہو کہ خس و خاشاک ہے کیا، وہی سلبی اذکار و خیالات جن کو مختصر طور پر شر انگیز، بد، غلط خیالات کہنا کافی ہوگا، واقفانِ راز کا اصرار ہے کہ یہی ہمارے تمام مصائب و آفات کا سرچشمہ ہیں، ان سے ذہن و قلب کو پاک و صاف کرنا چاہیئے، اس راز کو سمجھنے کے لئے اس نفسیاتی قانون پر غور کرو، جس کا ہم نے ابتدا ہی میں ذکر کیا ہے، افکار و خیالات ہی سے ہم زندگی کے مقاصد کا تعین کرتے ہیں، اب یہ مقاصد ہی محرک بن کر ہمیں عمل پر آمادہ کرتے ہیں اعمال کی تکرار عاداتِ راسخہ کے قیام کا باعث ہوتی ہے، اور سیرت سوائے ان عاداتِ راسخہ کے منظم مجموعہ کے اور کوئی چیز نہیں اور ہماری سیرت ہی

ہماری مسرت کا دُوسرا نام ہے ۔سلبی خیالات فاسد مقاصد کا تعین کرتے ہیں انہی سے تو شر کا صدور ہوتا ہے، شر کا ارتکاب عادت بن کر سیرت بد کی تشکیل کرتا ہے اب میکانکی طور پر بغیر غور و فکر کے شر ہی کا صدور ہونے لگتا ہے ۔ اور شر کے نتائج و شرارت سے ہم سب واقف ہیں، درد و رنج، غم و الم، حزن و یاس ۔

میدانِ فکر کا سلبی خیالات کے خس و خاشاک سے پاک ہونا ضروری ہے ورنہ نیک خیالات کی تخم ریزی لازمی، سلبی خیالات کو دور کرنے کا طریقہ ان سے جنگ کرنا نہیں، ان کا دور ہونا لگن ہوتا ہے، جب ہم ان سے مقابلہ کرتے ہیں تو ظاہر ہے کہ ہماری ساری توجہ ان ہی کی طرف لگی ہوتی ہے اب حیات (یا چشمہ حیات) کا بہاؤ توجہ کی طرف ہوتا ہے بالفاظ دیگر اگر ہم کسی گناہ یا شر کی جانب توجہ کریں، اس کے استیصال کی خاطر ہی تو زندگی کی تمام قوتیں اس کی جانب رُخ کرتی ہیں، اس طرح اس کی طاقت میں اور اضافہ ہوتا ہے، مثلاً اگر ہمیں بے خوابی کا مرض ہے تو ہم جس قدر اس کے متعلق فکر کریں گے اور اس کو دور کرنا چاہیں گے، بالفاظ دیگر اس کا مقابلہ کریں گے، اسی قدر تکلیف زیادہ ہوتی جائے گی، اس کے برخلاف اگر ہم اس کو بھول جائیں، تو ہم ٹھنڈی نیند سو جائیں گے، اسی طرح شر کے مقابلے سے اس کی طرف توجہ ہوتی ہے، اور توجہ سے اس کی قوت میں اضافہ ہوتا ہے ۔

۱۵

شر کا مقابلہ خیر سے کرنا چاہیئے، ظلمت کا مقابلہ نور ہے، ظلمت کو دور کرنا ہو تو نور کو داخل کرنا چاہیئے، ظلمت کا مقابلہ ظلمت سے کرنا

"ظلمات فوق ظلمات" کا مصداق بنتا ہے[1]، اگر تمہیں نفرت کو دور کرنا ہو تو محبت کا تصور کرو، خوف کو دور کرنا ہو تو شجاعت و ہمت پر نظر جماؤ، خود غرضی کے بجائے ایثارِ نفس کا خیال رکھو، اسی طرح تمہیں غصّہ کے بجائے حلم، بیماری کے بجائے صحت، کج خلقی کے بجائے خوش خلقی، شکایت کے بجائے صبر و شکر، خلق کی جبّہ سائی کے بجائے رازقِ مطلق کا خیال اپنے ذہن میں جمانا چاہیئے۔ تمہارا معروضِ فکر جو ہوگا رفتہ رفتہ وہی تم بھی بن جاؤ گے، یہی معنی ہیں جامی سامیؒ کے اس قولِ بلیغ کے ؎

گر در دل تو گل گذرد گل باشی ور بلبل بے قرار بلبل باشی
تو جزوی و حق کل است اگر روزے چند اندیشۂ کل پیشہ کنی کل باشی

اس فکر کے ایک دوسرے اعتبار پر غور کرو، دنیا میں وہی چیز بُری ہے جس کو ہم برا سمجھتے ہیں، اگر ہم اس کو برا نہ سمجھیں تو ممکن ہے کہ وہ ہمارے جسم کو آزار پہنچائے لیکن وہ ہمارے قلب کو چھو نہیں سکتی، یاد رکھو دنیا میں ہر چیز کی قیمت رائے پر منحصر ہے اور رائے تمہارے اختیار میں ہے، جب چاہو رائے کو ترک کر دو، پھر اس ملّاح کی طرح جس نے اپنے جہاز کو سمندری پہاڑیوں سے بچا نکالا ہو، تمہیں ہر طرف سکون نظر آئے گا، اگر تم اپنی رائے کو

---

[1] احادیث میں خطرات و وساوس کو دور کرنے کے لئے بعض اذکار یا مطلق ذکر کی ترغیب دی گئی ہے، اوپر علاج پیش کر رہے ہیں، اس کا استنباط انہی احادیث سے کیا گیا ہے، جو عجیب الاثر نفسیاتی طریقہ ہے۔

درک کردہ تو پھر یہ شکایت باقی نہ رہے گی کہ ہائے مجھے نقصان پہنچا۔ اس شکایت کو ترک کردو کہ ہائے مجھے نقصان پہنچا تو نقصان خود باقی نہ رہے گا، اسی لئے کہا گیا ہے کہ عقلمند آدمی کی خوش قسمتی یہ ہے کہ وہ کسی خوش قسمتی کا محتاج نہیں"

خیالات کا ماحول پر اثر ناقابلِ انکار ہے، خیالات کی پختگی اور قوتِ انسان کی روح کو سخت جسمانی تکلیف میں بھی مطمئن اور قوی رکھ سکتی ہے، ارادہ نتیجہ ہے توجہ کا یعنی خیال و فکر کا، جن خیالات کا اظہار انسان عمل میں کرنا چاہتا ہے، ان ہی پر توجہ مرکوز کرتا ہے، ان ہی کو ذہن میں دہراتا ہے، اُلٹتا ہے پلٹتا ہے، ان ہی سے اس کے ذہن کی فضا مملو ہوتی ہے اور یہی خیالات عالمِ آثار میں عمل کی صورت اختیار کرتے ہیں، خیال حقیقت ہے عمل اس کا ظہور ہے، ولیم جیمس نے سچ کہا ہے" زندگی کا ڈرامہ ایک ذہنی ڈرامہ ہے ساری مشکل ذہنی مشکل ہے"

میدانِ فکر کو خس و خاشاک سے پاک کرکے نیک خیالات کی تخم ریزی کرو، باغ کے بیجوں کی طرح خیالات کے انتخاب میں بھی حزم و احتیاط ضروری ہے اور جس طرح بیج کو پودے کی شکل میں نمایاں ہونے کچھ عرصہ لگا تھا اور تمہیں انتظار کرنا پڑا تھا اسی طرح خیالات کو قلب میں تغیر پیدا کرنے اور ہر نیک عمل میں ظاہر ہوتے دیر لگتی ہے، تمہیں پست ہمت نہ ہونا چاہیئے اور نہ رنجیدہ اگر تم نے اپنا کام قاعدے کے موافق کیا ہے اخس و خاشاک کو صاف کیا ہے، نیک خیالات کے بونے میں احتیاط برتی ہے تو شادمانی و مسرت، اطمانیت و برو قلبی، سرور و کیف وہ گلہائے شاداب ہیں جو نتیجہ کے

طور پر نہیں حاصل ہوں گے -

اِن حقائق سے واقف ہونے کی وجہ سے عقلمند جانتا ہے کہ دنیا میں اس کا کوئی دشمن نہیں، اگر اس کا کوئی دشمن ہو تو خود اس کا نفس ہے - اعدیٰ عدوك نفسك التي بين جنبيك (البیہقی میں حدیث ابن عباسؓ) اسلئے نہ وہ کسی پر ملامت کرتا ہے، اور نہ کسی کی مذمت، بدقلبی کے ساتھ محاسبۂ نفس کرتا ہے، صبر و سکون کے ساتھ اپنا اخلاقی فرض ادا کرتا ہے، صرف یہی نہیں کرتا بلکہ کسی مزید فرض میں مبتلا ہونے سے پرہیز کرتا ہے، وہ اپنے خیالات پر نظر رکھتا ہے، قلب کا دربان بن جاتا ہے، بدیا سلبی خیال کو داخل ہونے نہیں دیتا، داخل ہو جائے تو فوراً انیک یا ایجابی خیال کو اس کی جگہ لے آتا ہے اپنے افعال کو بے عیب بناتا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ حال نتیجہ ہے ماضی کا، قسمت نتیجہ ہے خیالات کا !

کامل گوید جہاں تمام و اہل است ناقص گوید کہ کوتہ است و سہل است
شطرنج ہماں عرصہ ہماں رخت ہماں ایں بردن و باختن ز علم جہل است

(سحابی استر آبادی)

قانونِ تجاذب اور سیرت سازی

بدمی کنم و نیک طمع می داری　　ہم بد باشد سزائے بد کرداری
با آنکہ خداوند کریم است و رحیم　　گندم نہ دہد بار چو جو می کاری

(رومیؒ)

قانونِ تجاذب (LAW OF ATTRACTION) ذہنی یا رُوحانی زندگی کا ایک ضروری کلّی اور عالمگیر قانون ہے نہ اس کی ضد قابلِ تصوّر ہے اور نہ اس کا کوئی استثناء ہے، کون شبہ کر سکتا ہے کہ جن طبائع میں مماثلت پائی جاتی ہے وہ ایک انجذابی قوت کے زیر اثر ایک دُوسرے پر غیر شعوری طور پر مسائل ہوتی ہیں اسی لئے تو عام طور پر کہا جاتا ہے کہ کسی شخص کی سیرت کا صحیح اندازہ کرنا ہو تو دیکھو اس کی صحبت کیسی ہے، قانون کی صداقت کا تو ہر کوئی قائل ہے لیکن ہمیں یہاں اس کے بعض تضمنات کو ذرا کھول کر بیان کرنا ہے۔

"ہشدار کہ راہ خود بخود گم نہ کنی"

فکر کی دنیا میں اس قانون کی سرگرمی پر غور کرو! ایجابی اور نیک خیالات مماثل خیالات کو اپنی طرف منجذب کرتے ہیں، اور ان کے درمیان ائتلاف

یا وابستگی ہوتی ہے۔ اسی طرح بداسلیبی اور شر انگیز افکار باہم وابستہ ہوتے ہیں ایک دوسرے کو پیدا کرتے ہیں، اپنی طرف کھینچتے ہیں، قوت پہنچاتے ہیں۔ تمہارے ذہن میں ایک خیال آتا ہے۔ اب اس کو تھوڑی دیر روکے رکھو، اس پر تخیل کی تعمیر قوتوں کو مرکوز کرو۔ مماثل خیالات کا خطور شروع ہو جائے گا۔ رفتہ رفتہ ان میں زیادتی ہو جائے گی اور بالآخر ان کا ہجوم ہونے لگے گا اور تمہارے ذہن کی فضا ان سے مملو ہو جائے گی۔ جن لوگوں نے اپنے ذہن کی تربیت میں کوشش کی ہے اور اپنے افکار و خیالات پر قابو پیدا کر لیا ہے، وہ اس قانون کو تعمیری طریقہ سے استعمال کرتے ہیں۔ اور دنیا سے اپنی قوتِ فکری کا لوہا منواتے ہیں!

دیکھو مصنّف کسی خاص موضوع پر قلم اٹھانا چاہتا ہے۔ ایک مرکزی خیال اس کے قلب پر چھایا ہوا ہے۔ وہ رات دن اسی میں غرق ہوتا ہے "سوتے جاگتے" اٹھتے بیٹھتے اس کا ذہن اسی میں مصروف ہوتا ہے۔ ناگہاں افکار و تصوّرات کا تسلسل شروع ہو جاتا ہے اور نامعلوم و ناقابلِ علم منبع سے خیالات کا چشمہ ابلنے لگتا ہے اور جب تک یہ حالت نہ ہو مصنّف لکھنے کی کوشش نہیں کرتا!

اسی طرح مقرر اپنی تقریر کی تیاری کے لئے اپنے موضوع پر ذہن کی سرچ لائٹ ڈالتا ہے۔ انہماک کے ساتھ اس پر غور کرتا ہے۔ قانونِ تجاذب کا غیر مرئی عمل مماثل تصورات کا ذخیرہ بہت جلد فراہم کر دیتا ہے۔ ان میں ترتیب بھی پیدا ہو جاتی ہے اور نظام بھی۔ یہ سب مبدءِ نامعلوم سے پیدا ہوتے ہیں اور مقرر کا ذہن ان کا قیام گاہ ہوتا ہے! یاد رکھو کہ مفکّر تصوّرات کا خالق نہیں

حامل ہوتا ہے وہ تصورات کو پیدا نہیں کرتا، وہ محض قانون کی پیروی کرتا ہے۔
اور نتیجہ کے طور پر اس کو خیالات و افکار کا تحفہ عطا کیا جاتا ہے، یہ عطا
ہر شخص کی استعداد کے مطابق ہوتی ہے۔

قانون کے تضمن و تعبیر سے واقف ہونے کے بعد حصول مسرّت اور
تزکیۂ نفس یا سیرت سازی کی خاطر اس کا استعمال کرو۔ اس کی توضیح میں ضخیم
کتابیں لکھی جاسکتی ہیں، لیکن ہم دو ایک مثالوں پر یہاں اکتفا کریں گے، فرض
کرو کہ بیماری کا وہم تمہارے دل میں پیدا ہوا۔ اب بجائے اس کے کہ تم اس کو
قبول کرلو اور اس کے متعلق فکر کرنے لگو اور ذہن کو مماثل وسوسوں اور وہموں کا
آماجگاہ بنالو تمہیں چاہیے کہ اس وہم کو نفی کرو اور وہ اس طرح کہ مبدء علم
کی طرف فوراً متوجّہ ہو جاؤ، یعنی حق تعالیٰ کی طرف رجوع کرو اور آہستگی سے
لیکن پورے اعتماد و اذعان کے ساتھ کہو حصنت نفسی بالحی القیوم الّذی
لایموت ابدًا ودفعت عنها السوء بالف الف لاحول ولا قوۃ
اِلّا باللّٰہ۔

یا یوں کہو "میں حق تعالیٰ کی حفاظت میں ہوں اور تمام بیماریوں اور
آفتوں سے محفوظ و مامون"، ان الفاظ کو پکار کر کہنے کی ضرورت نہیں محض

---

[1] میں نے اپنے نفس کو محفوظ کیا اس ذات پاک کی مدد سے جو حی اور قیوم ہے اور جو کبھی نہیں
مرتی اور اپنے نفس سے برائی کو دور کیا، اسی کی حول و قوۃ سے یہ حدیث کے الفاظ ہیں ضروری نہیں کہ
ان ہی کا استعمال کیا جائے ان کے بجائے کوئی اور موزوں الفاظ استعمال کئے جا سکتے ہیں۔

ذہنی طور پر یہ کہے جا سکتے ہیں جو شخص اس طرح سلبی خیالات کو ذہن میں اترنے
اور اپنی جگہ بنانے سے روکتا ہے، اور قانونِ تجاذب کو اجازت نہیں دیتا کہ
اپنے عمل سے ان سلبی، فاسد اور تباہ کن تصوّرات کی تعداد میں اضافہ کرے
اور قلب کو خوف و ہراس سے بھر دے بلکہ اس کے برخلاف اپنی حقیقت کی
جانب متوجّہ ہو جاتا ہے اور وہاں سے ایجابی اور قوت بخش تصوّرات کو اخذ
کرتا ہے جو قانون تجاذب کے عمل سے ہر آن زیادہ ہو جاتے ہیں، ہر دم نئی
طاقت حاصل کرتے جاتے ہیں، قلب کو قوی کرتے ہیں، سیرت کی تعمیر کرتے
ہیں، اور روز افزوں قوت کی وجہ سے عمل میں نمایاں ہوتے ہیں، صحّت کو درست
کرتے ہیں، احوال کو خوش گوار طریقہ سے بدل دیتے ہیں، موافق مرام نتائج
پیدا کرتے ہیں، اور اس طرح قسمت ہی کو بدل دیتے ہیں، یاد رکھو بیماری کی
اصلی علّت ذہنی ہوتی ہے، کیونکہ اگر ہم جراثیم کے نظریئے کو بھی مان لیں تو
بھی یہ مانی ہوئی بات ہے کہ جراثیم کا اثر قلب پر نہیں ہوتا جو ایجابی (POSI
TIVE) ہوتا ہے یعنی جو خود کو سلبی خیالات کا بازیگاہ نہیں بناتا، جو ہر دم
وساوس اور ہوا و ہوس کی نفی کرتا ہے، اور ان کی بجائے ایجابی اور حیات بخش
اور نیک خیالات کا اثبات کرتا رہتا ہے اور ان کے مبدء یعنی اپنی حقیقت کو
کسی آن فراموش نہیں کرتا، ایسا قلب قوت کا مرکز ہوتا ہے، توانائی کا مبدء
ہوتا ہے، ایسا قلب بیماری کا آسانی کے ساتھ کیسے شکار ہو سکتا ہے؟ بیماری
طبیعت کی کمزوری سے پیدا ہوتی ہے طبیعت اگر قوی ہو تو سرے سے بیماری کا
وجود ہی ناممکن ہے، یہ کوئی ایجابی چیز نہیں بلکہ سلبی صفت ہے، قدرت کا

نہ ہونا ہی عجز ہے، قوت کا نہ ہونا ہی بیماری ہے۔ سلبی خیالات، منفی افکار قوت کو سلب کرتے ہیں، قلب کو کمزور کرتے ہیں، اعضاء کو مضمحل کرتے ہیں، اعصاب میں تناؤ پیدا کرتے ہیں، اور اسی لئے ان کو ایجابی و ثبوتی تصورات سے بدل دیا جانا چاہیئے، ایجابی افکار کا مبدء حق تعالیٰ ہیں جوں ہی ہم نے ان کی طرف اپنا رخ کیا، گویا ہم ظلمت سے نکل کر روشنی میں آئے، اب روشنی کی کرنیں آہستہ آہستہ ہمارے جسم میں داخل ہوتی ہیں، ان سے مردہ اعصاب جاگ اٹھتے ہیں، مضمحل اعضاء میں توانائی آتی ہے۔ قلب و جگر تازہ دم ہو جاتے ہیں کھوئی ہوئی صحت پوری قوت کے ساتھ عود کر آتی ہے۔ صحت کے حصول کے لیئے اور اس کے قیام و بقا کے واسطے اس قطعی و حتمی نسخے کو یاد رکھو اور ہمیشہ اس کو استعمال کرتے رہو۔

قانون تجاذب کے استعمال کی ایک اور مثال پر غور کرو، تم پر کسی نے زیادتی کی ہے، تمہارے ساتھ غیر منصفانہ برتاؤ کیا گیا ہے، تمہیں غصہ آتا ہے، رنج ہوتا ہے، اضطراب ہوتا ہے اور تم اس نقصان پر ذہن کی ساری قوتوں کو مرکوز کر دیتے ہو، نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ سب سے پہلے "مماثل" خیالات کا ہجوم قلب پر ہونے لگتا ہے، یہ تاریک اندوہ خیز زہریلے خیالات جو قانون تجاذب کے عمل سے پیدا ہو رہے ہیں اپنے منحوس سایہ سے تمہاری ذہنیت کو مسموم کر دیتے ہیں تمہاری مسرت فنا ہو جاتی ہے، تمہاری صحت ٹوٹنے لگتی ہے، اور ممکن ہے کہ بالآخر تمہارا دماغ بھی متاثر ہو جائے اور اس میں فتور آنے لگے، آتش انتقام کا سوختہ فاتر دماغ اگر انتقام پر اتر آئے تو اس کے نتائج اور اثرات عموماً

مسرّت و طمانیت قلب کے لئے مفید نہیں ہوتے۔

مرغ پر نارستہ چوں پرّاں شود — لقمۂ ہر گربۂ درّاں شود

(مثنوی)

اب اگر تم "دع اذاھم و توکل علی اللہ (پ۲۲ ع ۲)" پر عمل کرتے ہوئے اس کو معاف کئے دیتے ہو اور اپنے خیالات کی رو کو بدل دیتے ہو سلبی خیالات کی بجائے ایجابی اذکار کے قبول کرنے کیلئے تیار ہو جاتے ہو تو تمہیں ان تمام شرانگیز و فتنہ خیز نتائج سے نجات مل جاتی ہے اور اب تجاذب کا قانون تمام اچھّی چیزوں کے رُخ کو تمہاری طرف پھیر دیتا ہے اب تم کو حقیقی معنٰی میں حریت نصیب ہوتی ہے، طمانیت حاصل ہوتی ہے مسرّت میسر ہوتی ہے کیونکہ تم نے سینہ کو کینہ سے پاک کیا، غضب سے پاک کیا، ان منفی جذبات کے دور ہو جانے سے تمہارے قلب سے ظلمت دور ہوئی، نور کا دخول ہوا، اور تمہاری ہستی کو ہر ذرہ اس نور سے جگمگا اٹھا، اسی لئے تو کسی عارف نے کہا ہے،

عالم تمام یک گُل بے خار می شود
دل را از کینہ گر دو صفا کند کسے

ہر فعل کا اثر، ہر حرکت کا ردِّ عمل، ہر علّت کا معلول قطعی ہوتا ہے، یہ قانون کلّی اور ضروری ہے، اب کینہ و غضب کے جذبات کا لازمی و جبری نتیجہ غم و حزن کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے، اسی طرح عفو و احسان و رحمت، کرم،

لہ چھوڑ دے ان کا ستانا اور بھروسہ کر اللہ پر۔

صبر و شکر کا قطعی و ضروری نتیجہ مسرت و طمانیت، توافق و الفت فلاح وغیرہ کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ علیت کے اس کلی عالمگیر وجوبی و لزومی قانون پر یقین ہو جائے تو احسن الی من اساء[1] حکم پر عمل کرتے ہوئے ہمیں کوئی تکلف نہیں ہوتا اور ہم اپنے اس عقیدہ کا اظہار کسی شاعر نامعلوم المعرفت کے سریلے نغموں میں یوں کرتے ہیں،

ہر کسے در راہ من خارے نہد من گل نہم!

او سزائے خار یابد من جزائے گل برم!

یہ سن کر اور مان کر بھی تم ذرا جھلا کر کہتے ہو، کیا یہ میرے بس کی بات ہے؟ بہر حال بشر ہوں اور فطرتاً مائل بہ شر ہوں، فطرتاً "ظلوم" ہوں، "جہول" ہوں، ظلمت و جہل میری ماہیت میں داخل ہیں، ان صفات عدمیہ کو مجھ سے دور کیسے کیا جا سکتا ہے، ان کی وجہ سے آفت و مصیبت میں مبتلا ہوتا رہتا ہوں لیکن سچ پوچھو تو حال یہ ہے

پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں — پھر وہی زندگی ہماری ہے!

(غالب)

تم ایک حد تک ٹھیک کہتے ہو آؤ ہم تمہیں ایک نفسیاتی طریقہ بتلائیں جس کے استعمال سے تمہیں غایت کے حصول میں آسانی ہوگی۔

جس شخص سے تمہیں نقصان پہنچا ہے اور جس کے خیال سے تمہارے

---

[1] جس نے تمہارے ساتھ برائی کی ہے اس کے ساتھ بھلائی کرو —

بدن میں سوزش ہوتی ہے اور جس کو معاف کرنا تم ممکن نہیں سمجھتے اس کو معاف کرنے کے لئے تمہیں چاہیے کہ کچھ دن اس صداقت پر غور کرو ۔

وما اصابکم من مصیبۃ	
فبما کسبت ایدیکم ویعفو	اور تم کو جو مصیبت پہنچتی ہے تو وہ تمہارے
عن کثیر۔ (پ ۲۵ ع ۵)	ہی ہاتھوں کے کئے ہوئے کاموں
	سے ہے اور بہت سے تو اللہ درگزر
	کر دیتا ہے ۔

نیز

انما ھی اعمالکم ترد علیکم	یہ تمہارے ہی اعمال ہیں جو تم پر
(الحدیث)	لوٹائے جا سکتے ہیں ۔

ذرا سوچو اصل میں تمہارا کوئی دشمن نہیں سوائے تمہارے نفس کے یہ سب کچھ اسی کا کمایا ہوا ہے اور اسی کے عین کا تقاضا یداک کسبتا وفوک نفخ۔[1] دوسرے کو اپنے افعال کا ذمہ دار قرار دینا تمہاری عقل کی کجی اور جذبات کی خامی کی دلیل ہے جوں جوں تم اس صداقت پر غور کرتے جاؤ گے، تم پر واقعات کھلتے جائینگے اور ہر آفت، ہر مصیبت کی علت تم اپنی ہی کسی حماقت کو پاؤ گے، اگر سلسلہ تفکر کو چند روز جاری رکھو گے تو حقیقت اس قدر مبرہن ہو جائے گی کہ بے اختیار چیخ اٹھو گے کہ غلطی میری تھی کسی دوسرے کی نہیں، اور حق تعالیٰ کی طرف ظلم کی نسبت تو کسی طرح نہیں کی جا سکتی،

---

[1] تیرے ہاتھوں نے کمایا ہے اور تیرے ہی منہ نے پھونکا ہے ۔

ان اللہ لیس بظلام للعبید[1]۔

ہر چہ ہست از قامتِ ناسازِ بے اندامِ ماست
ورنہ تشریف تو بر بالائے کس کوتاہ نیست

اس اصول کی صداقت کے وجدان میں کھل جانے کے بعد تم اپنے دشمن کو بھی معاف کرنے کے قابل ہو جاؤ گے۔

اگر تم جذباتی انسان ہو، عقل سے کافی حصہ تمہیں نہیں ملا ہے، اور مذکورۂ بالا اصول تمہاری سمجھ میں کسی طرح نہیں آتا تو تمہیں یہ دوسرا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے۔

جس شخص کو تمہیں معاف کرنا ہے اس کی شبیہ اپنے تخیّل کی مدد سے اپنی نظروں کے سامنے لے آؤ اور اب اس کو مخاطب کرکے کہو:۔

میں تمہیں (نام شخص) حسبتہ للہ پوری طرح معاف کرتا ہوں، دُعا کرتا ہوں کہ حق تعالیٰ تمہیں اپنی نعمتوں سے سرفراز کریں اور تمہیں نُورانی کر دیں، آمین۔"

اگر تم یہ عمل چند روز مسلسل و خلوص دل کے ساتھ کرتے ہو۔ تو کچھ دن تمہیں یہ معلوم کرکے تعجب ہوگا کہ تمہارے لئے اس شخص کو معاف کر دینا زیادہ مشکل تو نہیں، اپنے اس مجاہدہ سے اگر تم نے حسن خلق حاصل کر لیا کہ خلق کی طرف سے جفا کے باوجود ان سے وفا کی، رحمت و شفقت کو اپنا شعار بنایا،

---

[1] بیشک اللہ تعالےٰ اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔

اور ان کے لئے بخشش و مغفرت کی دعا کی، تو اب حقیقی مسرت، اطمینان، سکون قلبی، محبت، وہ انعامات ہیں جو حق تعالیٰ کی جانب سے تم کو عطا کئے جائیں گے، اور وہ تمہیں بطریق اجتبا اپنی جانب کھینچ لیں گے۔

راہ بسیار است مردم را بسوئے حق ولے
راہ نزدیکش دل بردم بدست آوردن است

ان ھذا لھو الفوز العظیم، لمثل ھذا فلیعمل العاملون۔ [1] (پ۲۳ ع۶)

---

[1] بیشک یہی مراد ہے بڑی مراد ملنی، ایسی چیزوں کے واسطے چاہیئے محنت کریں محنت کرنے والے۔

علاج خوف[1]

اس مختصر مقالہ میں میں نے ایک خونخوار جذبہ سے نجات کے چند نفسیاتی اصول پر روشنی ڈالی ہے، جو اول سے آخر تک قرآن کریم سے ماخوذ ہیں۔ خوف سے میری مراد، ماسوائے اللہ کا خوف ہے میں خشیۃ اللہ کو کوئی قابل علاج چیز نہیں سمجھتا معاذ اللہ یہ توہین مقصود ہے۔ انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء اصول کو میں نے اختصار کے ساتھ پیش کیا ہے، اور تفصیلات کو ترک کر دیا ہے۔

دو روزہ عمر پر ز خوف و خطر است — از غصہ غذائے خلق خون جگر است
آسودہ دلی ز بعد مردن ہم نیست — زیرا کہ خطرہ دراں طرف بسیار است

(ظہیر فاریابی)

انسان کی دو روزہ زندگی خوف و خطر سے بھری نظر آتی ہے، اس کے

---

[1] یہ مقالہ موتمر علوم اسلامیہ جامعہ عثمانیہ میں پڑھا گیا اور پہلی مرتبہ معارف نومبر سنہ ۴۲ء میں شائع ہوا

قلب پر اس خونخوار جذبہ کا پورا تسلط دکھائی دیتا ہے، جب وہ بستر سے اٹھتا ہے
تو لرزاں و ترساں اٹھتا ہے، اور تمام دن کے غم و غصہ کے بعد جب وہ پھر
بستر کی طرف لوٹتا ہے، تو بھی خائف و ہراساں ہوتا ہے، وہ ڈرتا کس چیز
سے ہے؟ کسی کو تو بیماری کا خوف ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ بیمار ہو جائے
اور دنیوی کامیابی کی ساری توقعات مٹی میں مل جائیں، جب کسی عزیز
یا دوست کی بیماری کی خبر سن لیتا ہے تو بے چین و پریشان ہو جاتا ہے، ڈرتا
ہے کہ کہیں مر نہ جائے! کسی کو خوف ہے کہ وہ ساری دولت کھو کر فقر و فاقہ
میں مبتلا نہ ہو جائے، ضعف و ذلت کا شکار نہ ہو جائے، کسی کو اپنی ملازمت
کی طرف سے خطرہ ہے، وہ حالات کو تشفی بخش نہیں پاتا، ڈرتا ہے کہ کہیں
بہت جلد اس کو بے روزگاروں کی صفوں میں شریک ہونا نہ پڑے ٹکڑوں کو
محتاج نہ ہو جائے، رزق کا دروازہ بند ہو جائے، کوئی اپنی ذمہ داریوں سے
گھبرا رہا ہے، یہ نا قابل برداشت نظر آرہی ہیں، اور وہ محسوس کر رہا ہے کہ
اس کی قوتیں زائل ہو رہی ہیں، اس کا دل بیٹھا جا رہا ہے، اور وہ اپنے
بلند مقام سے گر رہا ہے! کوئی ہے کہ اپنے ہم جنسوں سے ملنے سے گھبرا رہا ہے
وہ ان سے گفتگو نہیں کر سکتا، خوف سے اس کی زبان سوکھی جا رہی ہے
اور پسینوں میں ڈوب رہا ہے، کوئی خوف زدہ ہے لیکن نہیں جانتا کہ
کس چیز سے خوف زدہ ہے، اس کو اپنا مستقبل تاریک نظر آ رہا ہے، خطرہ
کا وہ تعین نہیں کر سکتا، لیکن خوف کی لہریں اس کے قلب میں اٹھ رہی ہیں
اور وہ بزدلی کی مدت مر رہا ہے، غرض خوف کا جذبہ عالمگیر ہے، ہر شخص

اس کا شکار ہے، کون ہے جس کو فکر نہیں، غم نہیں، خوف نہیں، شیخ عمادالدین فضل اللہ نے جو بات غم کے متعلق کہی ہے وہ خوف کے متعلق بھی صحیح معلوم ہوتی ہے، اور نفسیاتی طور پر غم نتیجہ ہے خوف کا۔

غم را زمن و سرا گریز از غم بنیست ‌ ‌ ‌ یاران قدیم را شکست از ہم بنیست
غم خوری بن کرد و من خوئے بغم ‌ ‌ ‌ ہچوں من و غم دو یار در عالم نیست

کیا خوف سے نجات بھی ممکن ہے؟ کیا اس ظالم جذبہ کی مرد افگن قوت کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے اور اس پر فتح حاصل کی جاسکتی ہے؟ کیا زندگی کے چند روز طمانیت خاطر اور برد قلبی کے ساتھ بسر کئے جا سکتے ہیں؟ علمائے نفسیات نے اس کا کیا علاج تجویز کیا ہے؟ حکماء نے کائنات کی کنہ و حقیقت پر غور کرنے کے بعد کیا اس کو خوفناک اور بے درد و بے رحم قوتوں کا نتیجہ قرار دیا ہے؟ کیا کائنات انسان کے لئے ایک صلیب کے مانند ہے جس پر بالآخر اس کو جان دینا ہے، خواہ پامردی اور ہمت کے ساتھ، یا نامردی اور بزدلی کے ساتھ، لرزاں و ترساں؟ قرآن کریم خوف سے کس حد تک نجات دیتا ہے؟

لا تخافوھم وخافون ان کنتم مؤمنین (پ۴ ع۹) کے کیا معنی ہیں کیا کوئی مخلوق و مربوب شیئے حقیقت میں نافع و ضار ہوسکتی ہے؟ اگر نہیں تو پھر خوف کیوں؟ کیا یہ وہم کا نتیجہ نہیں، باطل علم کی پیداوار نہیں؟ کیا اس سے نجات علم کی تصحیح سے ہوسکتی ہے، اختصار کے ساتھ بعض انہی اعتبارات پر یہاں بحث کرنی مقصود ہے۔

قرآن کریم کی تعلیم کی رو سے خوف سے نجات اور ان زنجیروں سے رہائی جن سے خوف نے ہماری گردنیں باندھ رکھی ہیں، دو طریقوں سے ہو سکتی ہے، ایک طریقہ ذہنی ہے اور دوسرا خارجی، پہلا طریقہ علم کی تصحیح پر مشتمل ہے اور دوسرا علم صحیح کے استعمال پر۔

(۱) علم کی تصحیح: خوف سے رستگاری حاصل کرنے کے لئے تمہیں سب سے پہلے اپنے مابعد الطبیعاتی مسلّمات کا جائزہ لینا چاہیئے، مذہب کی زبان میں یہ "عقاید" کہلاتے ہیں، ان کو عقل سے "ثابت" کرنے کی فلسفہ میں کوشش کی جاتی ہے اور مذہب میں ان پر محض "ایمان" لایا جاتا ہے اور ورائے طور عقل سمجھا جاتا ہے، لیکن یہ خلاف تجربہ اور خلاف وجدان نہیں ہوتے، یہ مذہبی زندگی کے دہبی جذباتی حسّی میلانات کی گہرائیوں میں اپنی جڑیں جمائے ہوئے ہوتے ہیں، تجربہ ان کی تائید کرتا ہے، وجدان ان کو اپنے ذوق کے مطابق پاتا ہے، عقل ان کی تردید نہیں کر سکتی۔

ایسا پہلا عقیدہ جس کو مان لینے کے بعد خوف سے قطعاً رہائی مل جاتی ہے حق تعالیٰ کا رحیم اور حکیم ہونا ہے فلسفیانہ الفاظ میں یوں سمجھو کہ کائنات تمہاری دشمن نہیں دوست ہے، تم روحانی کائنات میں زندگی بسر کر رہے ہو روحانی قوانین کی تم پر حکمرانی ہے، یہ قوانین کورانہ نہیں، ان کی ایک غایت اور مقصد ہے اگر تم ان کی نوعیت کو سمجھ کر ان کے ساتھ توافق پیدا کرو گے تو تم ان کو اپنا رفیق کار پاؤ گے اور نتیجہ طمانیت اور تسکین قلبی ہوگا، اگر تم نادانی اور جہل سے ان کی خلاف ورزی کرو گے تو نقصان تمہارا ہی ہوگا، خوف و غم میں مبتلا ہو گے

حزن و یاس سے نجات نہیں ملے گی اور اس کا باعث خود تمہارا جہل ہوگا اور جہل سے پیدا شدہ غلط عمل، یقین و ایمان کی شانانہ قدرت ہے قطعی طور پر ان لو کہ دنیا اچھی چیز ہے، کیونکہ اس کا مبدء خیر ہے، یہ مبدء حق تعالیٰ ہیں جو حکیم ہیں اور رحیم بھی! حق تعالیٰ خالق کائنات ہیں، جان کر کائنات کو پیدا کیا ہے، وہ جو کچھ کرتے ہیں، حق ہے بجا ہے، سراسر حکمت سے مملو ہے، باطل کا وہاں کوئی شائبہ نہیں، ماصنع اللہ فھو خیر ع

زانکہ ہر چہ صادر گشت نیکو است!

جب تمہارا یہ عقیدہ راسخ ہو جائے گا تو جہت خیر تم پر مبرہن ہو جائیگی خیر کا جلوہ تمہیں ہر طرف نظر آنے لگے گا، کمالات پر تمہاری نظر جائے گی، دل میں اور نظر میں، بصر میں اور بصیرت میں حق جلوہ افروز ہوگا، یعنی تمہاری طبیعت اور تمہاری فطرت بدل جائے گی، وہ عیب جو اور عیب بین نظر باقی نہ رہے گی جو ہر جگہ نقص کی تلاش کرتی ہے اور اس پر اعتراض کرتی ہے مستقبل کو خوف کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور واقعات کے وقوع کے پہلے ہی ان پر شر ہونے کا حکم لگاتی ہے اور وہمی بھوتوں سے لرزتی اور کانپتی ہے!

ایمان کی آنکھ سے دیکھو اور یقین کرنے والے قلب کی باتوں پر غور کرو کہ حق تعالیٰ رحیم ہیں کان بالمومنین رحیما، ان کا قول ہے وہ مومن پر رحیم ہیں، وہ اس کے دوست ہیں، مددگار ہیں، مولیٰ ہیں، نصیر ہیں، اللہ ولی الذین امنوا (پ ۳ ع ۲) جب حق تعالیٰ مومن کے ولی ہیں، اس پر رحیم ہیں تو پھر اس کو کس چیز سے خوف ہو سکتا ہے؟ حق تعالیٰ کو اپنا ولی جان کر وہ

کس چیز سے ڈر سکتا؟ وہ تو حق تعالیٰ کے زیر پرورش ہو جاتا ہے، اور حق تعالیٰ اس کے ساتھ لیشایانِ رحمت پیش آتے ہیں، اس کے تمام معاملات کے کفیل ہوتے ہیں، وکیل ہوتے ہیں، جب یہ ادراک مومن کے قلب میں قوی ہو جاتا ہے تو اب وہ بہ یک جنبت خوف و حزن سے آزاد ہو جاتا ہے، اور لاخوف علیہم ولا ھم یحزنون کا مصداق بن جاتا ہے!

خوف کے وقت حق تعالیٰ کے رحیم و حکیم ہونے پر غور کرو، مضطرب قلب کو پریشان دماغ کو، معطّل حواس کو، کچھ دیر کے لئے اس نقطہ پر مرکوز کرو، یہی وہ نقطہ ہے جو انوار کا منبع ہے، قوتوں کا مرکز ہے، توانائیوں کا مبدء ہے اسی پر نظر جما کر تم خوف سے نجات حاصل کروگے، تمہارا ضعف دور ہوگا، حزن رفع ہوگا، سکون حاصل ہوگا، سرور حاصل ہوگا، طمانیت و تسکین قلبی نصیب ہوگی،

جب حق تعالیٰ حکیم و رحیم ہیں اور وہی جہاں دار ہیں تو ظاہر ہے کہ ؎

جہاندار داند جہاں داشتن

اب مجھے کسی تجربہ سے خوف زدہ ہونے کی کیا ضرورت ہے۔

ہر چہ آں خسرو کند شیریں بود!

ہر واقعہ کی تخلیق اس ہمہ خیر ذات سے ہو رہی ہے جو حکیم مطلق بھی ہے اور رحیم و کریم مطلق بھی؛ اب زندگی کا کوئی واقعہ میرے لئے مضر نہیں ہو سکتا وہ بحیثیت مجموعی میرے لئے مفید ہے خیر برتر کے حصول کا ذریعہ ہے یہ میرا جہل ہے کہ باوجود حق تعالیٰ کو رحیم اور ولی مان کر پھر یہ خیال کرتا ہوں کہ وہ مجھے

نقصان پہنچانا چاہتے ہیں، درپے آزار ہیں، جب تھوڑے سے غور و فکر کے بعد میری سمجھ میں یہ بات آگئی کہ حق تعالےٰ رحیم ہیں، اور میرے حال کے علیم تو جمعیت تامّہ مجھے نصیب ہوتی ہے، اور خوف بالکل رفع ہو جاتا ہے!

دوسرا اصول جس کے مان لینے کے بعد خوف قطعی طور پر دور ہو جاتا ہے حق تعالیٰ کی معیت کا عقیدہ ہے، حق تعالیٰ ہمارے ساتھ ہیں، جہاں کہیں ہم ہوں وھو معکم اینما کنتم (پ ۲۷ ع ۱۱) جب مجھے اس امر کا تحقق ہو جاتا ہے کہ حق تعالیٰ ہمیشہ میرے ساتھ ہیں، مجھ سے بہت قریب ہیں "اقرب" ہیں۔ میری حفاظت فرما رہے ہیں، ان کی معیت کی وجہ سے میں تمام شر و گزند سے محفوظ ہوں، جہاں بھی ہوں محفوظ ہوں، ان کے حفظ و امان میں ہوں، تو پھر خوف میرے قلب سے دور ہو جاتا ہے، اور سرور و اطمینان بلکہ ایک ذوق و مستی پیدا ہو جاتی ہے!

در ہجر تو بودہ اندوہ و آزارم　　　از وصل تو رفت ہستی و پندارم

شادی آمد و نصیب جانم شد　　　اکنوں جان و تن خویش را راحت دارم

جب بھی خوف کے حالات پیدا ہوں، واقعات خطرناک نظر آئیں، غم کے بادل قلب پر چھانے لگیں تو ہمیں اس امر کا احساس کرنا چاہیے کہ حق تعالیٰ ہمارے ساتھ ہیں، وہ رحیم ہیں، قادر مطلق ہیں، ان کی معیت کی وجہ سے مجھے علوئے تمکین حاصل ہے، انتم الاعلون واللہ معکم کا مصداق ہوں، ان کو رکھ کر مجھے کس چیز سے نقصان پہنچ سکتا ہے، ان کی معیت کی وجہ سے میں ہر شئے سے بلند ہوں ان کو رکھ کر مجھے کسی شئے کی نہ خواہش ہے اور نہ اس کے

نہ ملنے کا غم، جب مجھے کسی چیز کی خواہش ہی نہ ہو، تو پھر شکستِ خواہش کا بھی احتمال نہیں اور اس کے نتیجہ غم و خوف سے بھی آزاد ہوں!

لیکن غم و مصیبت و خوف کی حالت میں حق تعالیٰ کی معیت کا احساس اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب ہم راحت اور آسودگی، فراغت و اطمینان کی حالت میں بھی حق تعالیٰ کی یافت و شہود سے غافل نہ رہے ہوں، ان کی یاد سے ذہول نہ رہا ہو اور کسی عارف کے یہ الفاظ ہمارے پیشِ نظر رہے ہوں

تشنۂ او میر گر تو زندہ — خاک آں در باش گر تو بندہ
ذرّہ درد خدا در دل ترا — بہتر از ہر دو جہاں حاصل ترا

جب ہمارے دل میں حق تعالیٰ کا درد ہو، ان کی معبودیت و ربوبیت کا اقرار ہو، ذلّت کا اظہار ان ہی کے سامنے ہو، ذل و افتقار کی نسبت ان ہی کے ساتھ وابستہ ہو تو پھر خوف اور پریشانی کے وقت ہمیں ان کی معیت کا شدید احساس ہوتا ہے، ہم محسوس کرتے ہیں کہ وہ ہمارے ساتھ ہی تو ہیں، مونس ہیں، غم خوار ہیں، نصیر ہیں، وکیل ہیں، اسی طرح ہمارے قلب کی حفاظت ہو جاتی ہے، سکینت و طمانیت پیدا ہوتی ہے اور خارجی حالات میں بھی خوشگوار تغیر پیدا ہو جاتا ہے اور ہم تمام مصائب سے محفوظ ہو جاتے ہیں اور حزن سے خوف سے رہائی مل جاتی ہے۔

اگر تم خوف سے بالکلیہ رہائی کے خواہاں ہو، اس کی بیخ و بنیاد کو صحنِ دل سے اکھاڑ کر پھینک دینا چاہتے ہو، "جمعیتِ تامّہ" کے حصول کے خواہشمند ہو تو خودشناس بنو، عرفانِ نفس حاصل کرو، اپنی حقیقت سے آگاہ ہو جاؤ،

اس عرفان کا آلہ محض عقل نظری نہیں، اس کے لیئے اس عقل کی ضرورت ہے جو بقول اقبال "ادب خوردہ دل" ہے، عقل نظری (قیاسات عقل یونانی) تمہیں خودشناسی میں زیادہ مدد نہیں دے سکتی، یہ زیادہ تر ادہام باطل کا نقشہ تمہاری نگاہوں کے سامنے پیش کرتی، اور پھر اس کو بگاڑتی رہتی ہے یہی اس کا محبوب مشغلہ ہے، یہ تمہیں لذت حضور سے محروم رکھتی ہے کیونکہ خود اس کی تقدیر میں حضور نہیں،

انجام خرد ہے بے حضوری ہے فلسفۂ زندگی سے دوری

(اقبالؒ)

تمہیں اس جگہ اقبال کی نصیحت پر عمل کرنا چاہیئے جو "پیر رومؒ" کی ہدایت کے مطابق تم سے کہہ رہے ہیں،

عقلے بہم رساں کہ ادب خوردۂ دل است

یہ عقل تمہیں اس وقت حاصل ہوگی جب شیخ بوعلی سینا کی تحقیقات سے صرف نظر کرکے "سخن محمدیؐ" سے دل بستگی پیدا کرو۔

دل در سخن محمدیؐ بند اے پور علی ز بوعلی چند

(حکیم خاقانی در تحفۃ العراقین)

اب تمہیں اس عقل کے ذریعہ جو نور وحی کی ہدایت و رہبری میں قدم اٹھا رہی ہو، اپنی ذات کی معرفت حاصل کرنی چاہیے، اس معرفت کے حصول کے بعد تم کو اپنی عبدیت کا علم ہوجائے گا کہ تم ذات و ماہیت کے لحاظ سے معلوم ہو خارجًا مخلوق ہو، غیر ذات حق ہو، حق تعالیٰ تمہارے ظاہر و باطن ہیں۔

اوّل و آخر ہیں، تم کو محیط ہیں، تمہارے ساتھ ہیں، تم سے قریب و اقرب ہیں تم حق تعالیٰ ہی کے وجود سے موجود ہو، ان ہی کی حیات سے زندہ ہو، ان ہی کے علم سے جانتے ہو، ان ہی کی قدرت و ارادے سے قدرت و ارادہ کا استعمال کرتے ہو، وجود اور تمام صفات وجود یہ تمہارے پاس امانت ہیں، یہ تمہارے لئے اصالۃً نہیں امانۃً ہیں، تم فقیر ہو اور امین، امانت کا استعمال جب کائنات کے مقابلہ میں کرتے ہو تو خلیفہ اللہ کہلاتے ہو، اور جب امانت کا استعمال حق تعالیٰ کے مقابلہ میں کرتے ہو، تو ولی اللہ کہلاتے ہو، یہی چار اعتبارات ہیں، عبداللہ کے، فقر، امانت، خلافت، ولایت عبداللہ کے پاس اللہ ہیں، ان کی ہویت و اینت ہے، صفات و افعال ہیں، ملک و حکومت ہیں[له]، عبداللہ کا قیام ذات اللہ میں ہوتا ہے ذات اللہ میں خوف کا کیا اعتبار ہو سکتا ہے، وہ تو سرور محض ہے، اس لئے عبد بھی اللہ کی جہت سے اپنے اندر ناقابل بیان سرور محسوس کرتا ہے، طمانیت محض و ذوقِ خالص کا مخزن بن جاتا ہے، کیا خوب کہا ہے کسی عارف تام المعرفت نے ؎

چوں بدانستی کہ ظلِّ کیستی | فارغی گر مردی و گر زیستی
قطرۂ نوری مرا با نور باش | بگذر از غم دائماً مسرور باش

(رومی رح)

له توضیح کے لئے دیکھو مصنف کی کتاب "قرآن اور تصوف"۔

انسان اپنی اس حقیقی جہت کو فراموش کر کے خوف وحزن میں مبتلا ہوتا ہے، یا پھر خوف وحزن اس کے قلب پر محیط اس لئے کہ وہ سرے سے اپنی حقیقت سے آگاہ ہی نہیں، اس لئے ہر درد، ہر غم، ہر خوف وہراس کا علاج خود اس کے ہاتھ میں ہے اور وہ اس سے جاہل، اس سے زیادہ محرومی کیا ہو سکتی !!

یک سبد پر ناں ترا فرق سر　　　تو ہمی جوئی لب ناں در بدر!
تا بزانوئے میان قعر آب　　　وز عطش وز جوع گشتستی خراب

(رومی)

(۲) علم صحیح کا استعمال - جب تم کو اپنی حقیقت کا عرفان حاصل ہو گیا، جب تم نے یہ جان لیا کہ حق تعالیٰ مومن کے ساتھ ہیں، اس سے قریب اور اقرب ہیں، اس کے ظاہر و باطن ہیں، جب تم کو یہ یقین ہو گیا کہ حق تعالیٰ مومن کے ولی ہیں، مولیٰ و نصیر ہیں، اس پر رحیم ہیں، تو اب خوف کے وقت اپنے ایمان کی قوت سے کام لو، جرات کے ساتھ کہو کہ کائنات کی کوئی چیز تم کو خوف زدہ نہیں کر سکتی،" اپنے خوف زدہ نفس کو مخاطب کر کے کہو،

الیس اللہ بکاف عبدہ　　　کیا اللہ اپنے بندہ کے لئے کافی نہیں
ویخوفونک بالذین من　　　کیا تجھ کو یہ لوگ ان سے ڈراتے ہیں
دونہ (پ۲۴ع ۱)　　　جو خدا کے ماسوا ہیں ؟ (ڈرمت)

ہمیں اپنے تحت الشعور نفس کے ساتھ بچوں کا سا برتاؤ کرنا چاہیئے، دیکھو بچہ اندھیری رات میں جاگ پڑتا ہے، اور ڈر کر رونے لگتا ہے، تم اس سے

کہتے ہو ڈر دوست یہاں کوئی چیز ایسی نہیں جس سے تم کو ڈر ہو، خوف کی چیزیں صرف تمہارے خیال میں ہیں، کمرے میں نہیں، اس طرح خوف کی نفی کرنے کے بعد تمہیں ان چیزوں کا اثبات کرنا چاہیئے جو سچ ہیں، مثلاً تم کہو گے میں تمہارے ساتھ ہوں، تمہارے بازو وہی ہیں تو ہوں، کیا مجال کہ کوئی چیز تم کو چھو سکے، اس طرح اطمینان دلانے کے بعد کہ تم پاس ہی ہو، اور اس کو تمہاری قوت پر یقین ہونے کی وجہ سے کہ تم اس کی حفاظت کرنے کے قابل ہو، بچہ پھر بے فکری کی نیند سو رہتا ہے!

یہی طریقہ تم کو اپنے تحت الشعوری نفس کے ساتھ استعمال کرنا چاہیئے پہلے خوف کے اسباب کی نفی کرنی چاہیئے، جرأت و ہمت کے ساتھ اس کو یقین دلانا چاہیئے کہ ساری دنیا میں خدا کے سوا تمہیں کوئی چیز ڈرا نہیں سکتی، تم جانتے ہو کہ یہ شیخی نہیں، واقعہ ہے، حقیقت کے عین مطابق ہے، مومن جس پر حق تعالیٰ رحیم ہیں، جس کے ساتھ وہ ہیں، جس کی نصرت کا وہ اپنے اوپر حق سمجھتے ہیں حقا علینا نصر المومنین۔ جس پر وہ ماؤں سے زیادہ شفیق اور مہربان ہیں، ایسا مومن کائنات میں سوائے حق تعالےٰ کے کس چیز سے ڈر سکتا ہے اور ڈر کر مومن رہ کیسے سکتا ہے؟ دیکھو ساری اشیاء مخلوق ہیں، مربوب ہیں، محکوم ہیں، مملوک ہیں جب تک خالق و حاکم مالک و رب نہ چاہے، یہ تمہیں نقصان کیسے پہنچا سکتی ہیں؟ حکم اللہ ہی کا چلتا ہے الحکم للہ، متصرف فی الامور حق تعالیٰ ہی ہیں، ان ہی کے قبضۂ قدرت میں تمام جانداروں کی پیشانی کے بال ہیں، ما من دابة الا ھو اٰخذ بناصیتھا۔ ڈرنا ہمیں ان ہی کے

جلال سے چاہیئے نافع وہ ہیں اور ضار وہ، معز وہ ہیں اور مذل وہ، اور سارا عالم فقیر اور محتاج، نہ نفع کی قوت رکھتا ہے اور نہ ضرر کی، اسی لئے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :—

ولو جهد العباد ان ینفعوك بشئ لم یقضه الله لك
لم یقدروا علیه ولو جهد العباد ان یضروك بشئ لم یقضه
الله علیك لم یقدروا[1]

اگر سب بندے مل کر کوشش کریں کہ تجھے اس چیز سے نفع پہنچائیں جو اللہ نے تیرے لئے مقدر نہیں کی، تو وہ ایسا کرنے کی قدرت نہ پائیں گے اور اگر سب بندے مل کر تجھے کسی چیز سے ضرر پہنچانے کی کوشش کریں جو اللہ نے تیرے لئے مقدر نہیں کی، تو وہ اس پر قدرت نہ پائیں گے ۔

اس صداقت پر پورا یقین رکھ کر اپنے نفس سے کہو کہ تجھے قطعًا کسی چیز سے ڈرنا نہیں چاہیئے ! اور زندگی کا یہ عجب قانون ہے کہ جوں ہی خوف قلب سے دور ہوا، اب دنیا کی کوئی چیز ہمیں گزند نہیں پہنچا سکتی، حضرت دانیال ؑ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انہیں شیروں کے غار میں ڈال دیا گیا۔ لیکن

---

[1] اس حدیث کا ایک حصہ ہے جو حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ سے مروی ہے اور جسکو حضرت غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانی رحؒ فتوح الغیب مقالہ ۴۲ میں پیش فرماتے ہیں اور تاکید کرتے ہیں کہ ہر مومن کو چاہیئے کہ اس حدیث کی اپنے دل سے تکرار کرتا رہے تاکہ دنیا و آخرت میں تمام آفات سے محفوظ رہے اور رحمت سے دونوں جہاں میں عزت پاسکے ۔

شیروں نے انہیں چھوا تک نہیں، اس کی نفسیاتی توجیہ یہی ہو سکتی ہے کہ حضرت
دانیال ؑ کا حق تعالیٰ پر اتنا اعتماد تھا کہ خوف ان کے سینہ میں مطلق نہ تھا، اور
اسی وجہ سے شیر انہیں چھو نہ سکے، یہ تو ہم سبھی جانتے ہیں کہ کتا جو خوف زدہ
شخص پر حملہ کر دیتا ہے، اس شخص کے قریب بھی نہیں آتا جو بالکل بے خوف
ہوتا ہے یہ جو سنیاسی جنگلوں میں جا بیٹھتے ہیں، جہاں ہر قسم کے موذی اور
درندہ جانور بھی موجود ہوتے ہیں، کیسے محفوظ رہتے ہیں؟ ان کی بے خوفی
ان کے لئے سب سے بڑی حفاظت کا کام دیتی ہے، جو شخص حق تعالیٰ کو
محافظ سمجھتا ہے، وہ بے خوف ہوتا ہے، کامل بے خوفی نتیجہ ہے ایمان راسخ کا

نفی کے بعد اثبات، یعنی نفس کو یہ یقین دلانے کے بعد کہ خوف کی کوئی
وجہ نہیں، اب ہمیں حق تعالیٰ کی معیت، احاطت، قرب واقربیت کا ادراک
کرنا چاہیئے، جس طرح کہ چھوٹے بچے کو ہم نے اپنی موجودگی کا یقین دلایا
تھا، اسی طرح نفس کو حق تعالیٰ کے حضور و معیت کا یقین دلانا ضروری ہے۔
جب وہ یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ اس کا قیام حق تعالیٰ کی ذات میں ہے۔
وہ حق تعالےٰ کے نور میں منکشف ہے، اس کے داہنے بائیں اوپر نیچے آگے
پیچھے حق تعالیٰ کا نور ہے، وہ نور کے قلعہ میں محصون ہے، محفوظ ہے، تو پھر
خوف کا سایہ اس کے قلب سے اٹھ جاتا ہے (ظلمت نور کی موجودگی میں
کیسے ٹھہر سکتی ہے؟) سرور و طمانیت حقیقی کا نفوذ اس کی رگ و پے میں ہونے
لگتا ہے، وہ قطرۂ نور بن جاتا ہے، سراپا نور ہو جاتا ہے، اور مسرت دائمی
سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔

اس مقصود کے حصول کے لئے تمہیں بعض ازلی وابدی صداقتوں کا دہرانا بڑی مدد دے گا، جب خوف و ہراس کی لہریں تمہارے قلب میں قیامت خیزی کر رہی ہوں اور وہ بیٹھا جا رہا ہو، اور تمہاری نظر میں دنیا تاریک ہو رہی ہو تو تمہیں بیٹھ جانا چاہیئے، اور آہستہ سے لیکن استقلال و ثابت قدمی کے ساتھ ہیبت حق کا ادراک کرتے ہوئے، ان صداقت بھرے الفاظ کی تکرار کرنی چاہیئے،

حسبی اللہ نعم الوکیل فنعم المولیٰ ونعم النصیر — مجھے اللہ کافی ہے، اور وہ کیا خوب کارساز ہے، کیا خوب مولیٰ ہے اور کیا خوب مددگار ہے۔

ان کی تکرار سے ہماری بصیرت کی آنکھیں کھلتی ہیں، ہمیں حق تعالیٰ کی کفایت کا یقین ہوتا ہے، اور اسی یقین کی وجہ سے ہمیں خوف سے نجات ملتی ہے، آزادی نصیب ہوتی ہے۔

جامع ترمذی میں ہے کہ جب حضور انور صلعم کو کوئی مشکل پیش آتی، فکر کا بار قلب انور پر ہوتا ہے تو حق تعالیٰ سے مخاطب ہو کر فرماتے،

یاحی یاقیوم برحمتک استغیث۔

درد بھرے دل سے الغیاث کی یہ پکار نکلی کہ حی القیوم کی رحمت نے قلب کو سنبھالا دیا، اور اس کی حفاظت کے سامان فراہم کر دیئے!

یاد رکھو کہ خوف طاری ہوتا ہے خوف پیدا کرنے والے خیال کو قبول کر لینے کی وجہ سے اس خیال کا مقابلہ ذہن کی اس سطح پر رہ کر کرنا ناممکن ہے جس

سطح پر خوف کی موجیں اٹھ رہی ہیں، کوشش اس بات کی کرنی چاہئے کہ قلب اس سطح سے بلند ہو جائے اور بالاتر سطح پر قدم جمائے دیکھو سمندر کا طوفان اسی وقت فنا کا باعث ہوتا ہے جب ہم اس کی تباہ کن موجوں میں گھر جاتے ہیں لیکن اگر ہم کسی بلند پہاڑی پر چڑھ جائیں، تو پھر ان بلاخیز موجوں کے شور شور سے ہمیں نجات مل جاتی ہے، کیونکہ اب ہم ان کے پنجے سے باہر ہیں بالکل اسی طرح جب ہم خوف کی حالت میں حق تعالی کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں تو ہمارا قلب خوف کی سطح سے بلند ہو جاتا ہے، اور اس مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں سکون ہی سکون ہے، شانتی ہی شانتی، سکھ ہی سکھ!

یاد رکھو قرآن کریم کی تعلیم کی رو سے ہمارے سارے دردوں کی دوا حق تعالی کی محبت ہے، غیراللہ سے بیزاری ہے، درد والم خوف وہراس کے وقت اپنے رخ کو حق تعالے کی طرف اخلاص کے ساتھ پھیر دو، اور عجز کے ساتھ ان کے قدموں پر پڑ جاؤ، اور پھر تمہارا کام بن نہ جائے تو شکایت کرنا۔

در حضرت ما دوستی یکدلہ کن — ہر چیز کہ غیر ماست آنرا یلہ کن

یک صبح باخلاص بیا بر در من — گر کار تو بر نیاید آنگہ گلہ کن!

(ابوسعید مہنہ)

علاجِ حُزن[1]

بے خلش نازیستن نازیستن | باید آتش در تہِ پا زیستن
زیستن این گونہ تقدیرِ خودی است | از ہمیں تقدیر تعمیرِ خودی است

(اقبال رح)

ابتلا یا آزمائش انسان کی تقدیر ہے، اور ابتلا ہوتی ہے زندگی کی محبوب و مرغوب چیزوں کے روک لیے یا فنا کر دیے جانے سے، ان پر آفات کے نزول سے، ان کے حصول میں مشکلات کے پیدا ہونے سے، خلش سے، درد و غم سے، رنج و الم سے، قلب کے تار ٹوٹنے سے، یا زیادہ جامع الفاظ میں یوں کہو خوف سے، بھوک سے، جان و مال و ثمرات کے نقص و کمی سے اور ابتلاء کا مقصد سیرت کی تعمیر ہوتی ہے، خودی کی پختگی ہوتی ہے، حیات کی زیادتی ہوتی ہے، قوت کی توفیر ہوتی ہے، خاص و عام رحمتوں اور راحتوں کا نزول ہوتا ہے، اور جو شخص ابتلا سے بھاگنا چاہتا ہے، وہ ایک گونہ وجود کی

---

[1] یہ مقالہ ایجوکیشنل کانفرنس حیدرآباد نومبر ۴۳ء کے اجلاس نظام آباد دکن میں سنایا گیا۔

قانون کی ہمہ گیر قوت سے بچ نکلنے کی کوشش کرتا ہے اور نادانستہ طریقہ پر اپنا ہی نقصان چاہتا ہے، اپنی خودی کی تکمیل و تعمیر نہیں چاہتا، حیات پر قوت کی توفیر نہیں چاہتا، وہ بھول جاتا ہے کہ

دوام ماز سوزِ ناتمام است | چو ماہی جز تپیش بر ما حرام است
مجو ساحل کہ در آغوشِ ساحل | تپیدن یک دم و مرگ دوام است

(اقبالؒ)

اپنے اس دعوٰی کی تائید میں ہم آپ کو کچھ دیر کے لئے فکر و نظر کی دعوت دیتے ہیں اور کائنات و فطرتِ انسانی کے چند کلی و ضروری قوانین کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرتے ہیں، ع

یک تنقیہ دماغ می باید کرد !

انسان، احتیاج کا دوسرا نام ہے، انسان کی عضویت کی تحدید و تقیید ہی سے احتیاج پیدا ہوتی ہے، یعنی اس کی فطرت ہی میں احتیاج ہے، وہ حاجت مند ہے، فقیر ہے اور درد نتیجہ ہے اسی فقر و احتیاج کا، اور فطری طور پر وہ اس درد کی دوا چاہتا ہے،

عالم ہمہ دردست و دوا می خواہد | از خوانِ کرم برگ و نوا می خواہد
کس بے حاجت نمی تواند دیدن | درویش غذا شہ اشتہا می خواہد

(سحابی استر آبادی)

اب اس عالم اسباب و علل میں جس کی تشبیہ انگارہ سے دی جاسکتی ہے مجاہدہ اور عمل ہی سے احتیاج و فقر اور درد و غم بڑی حد تک دور کئے جاسکتے ہیں

جو اپنی بنیاد و اساس کے طور پر علم صحیح کو فرض کرتا ہے، مجاہدہ بغیر علم صحیح کے ممکن نہیں، اور علم صحیح عمل سے علیحدہ ہو کر نافع نہیں ہو سکتا۔
اس لئے ہم انہیں دو پہلوؤں کو یہاں اختصار کے ساتھ پیش کر کے اپنے دعویٰ کی تائید کریں گے۔

یاد رکھو کہ انسان کی زندگی اس معنیٰ میں ہمیشہ خطرناک زندگی ہے کہ درد و غم، سوز و الم اس کی ماہیت میں داخل ہیں، کائنات کے اندرونی اسرار سے جو لوگ واقفیت رکھتے ہیں، ان کا ایقان ہے کہ کائنات کا مبدء حق تعالیٰ ہیں جو حکمت و خیر کے اعتبار سے مطلق و لامحدود ہیں، وہی اس کائنات پر حکمران ہیں، حکم ان ہی کا چلتا ہے، مشیت ان ہی نافذ ہو رہی ہے، لہٰذا یہ کائنات مظہر ہے خیر و حکمت کا، پھر درد و غم جو انسان کی زندگی کا ساتھ نہیں چھوڑتے اور ہر رنگ میں انسان جو مبتلا رہتا ہے اس میں کونسی حکمت ہے اور خیر کا کونسا نمایاں پہلو ہے؟ ان ہی واقفانِ راز کا بیان ہے کہ اہلِ ذکر یا مشاہدہ پر اس کی حکمت مبرہن ہے اس کی توضیح تین قوانین کی شکل میں پیش کی جا سکتی ہے،

(۱) درد و غم، سوز و الم نتیجہ ہے، جرم و معصیت کا، گناہ و بدکرداری کا رذائلِ اخلاق اور ان سے پیدا ہونے والے افعال و اعمال کا، اس راز کو قرآنِ حکیم نے اس آیت میں پیش کیا ہے،

وما اصابکم من مصیبۃ	تم کو جو کچھ مصیبت پہنچتی ہے وہ تمہارے
فبما کسبت ایدیکم ویعفوا	ہی ہاتھوں کے کیے ہوئے کاموں سے ہے

عن کثیر - پ ۲۵ ع ۵) اور بہت سے تو درگزر ہی کر دیتا ہے۔

اسی راز کو کسی اور جگہ زیادہ واضح الفاظ میں یوں ظاہر فرمایا گیا ہے،

اولما اصابتکم مصیبۃ قد	اور جس وقت تم کو ایک تکلیف پہنچی
اصبتم مثلیہا قلتم انّٰی ھذا	کہ تم اس سے دو چند پہنچا چکے ہو۔ تو
قل ھو من عند انفسکم۔	کہتے ہو کہ یہ کہاں سے آئی۔ آپ فرما
(پ ۴ ع ۵)	دیجیئے کہ یہ تکلیف تمکو تمہارے ہی طرف سے پہنچی۔

صاحب کتاب (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس اصول کی تفسیر میں فرمایا کہ انّما ھی اعمالکم ترد علیکم[1]۔ یہ تمہارے ہی اعمال ہیں جو تم پر لوٹائے جاتے ہیں قرآن و خبر سے اس راز کو معلوم کرکے حکماء و صوفیائے اسلام نے یہ اصول قرار دے لیا ہے کہ

ان جمیع الوجود یقابلکم بحسب ما یبرز منکم من الاعمال فانظروا کیف تکونون، فان الظل تابع للشاخص فی العوج والاستقامۃ

(شیخ ابوالنجار)

یعنی جو اعمال تم سے سرزد ہوتے ہیں ویسے ہی بدلہ بھی دیا جاتا ہے اسی لیئے ذرا اپنے اعمال پر نظر رکھنا، کیونکہ ظل یا سایہ شخص کے تابع ہوتا ہے، اگر کوئی شئے ٹیڑھی ہے تو اس کا سایہ بھی ٹیڑھا ہوگا، اور اگر سیدھی ہے تو سایہ بھی

---

[1] انما ھی اعمالکم احصیھا علیکم فمن وجد خیرا فلیحمد اللّٰہ و من وجد غیرھا فلا یلومن الا نفسہ۔

سیدھا ہوگا جس نے توقع کی کہ ٹیڑھی شئے کا سایہ سیدھا ہو تو اس نے محال کی
تمنا کی من طلب استقامۃ الظل مع عوج الشاخص فقد رام المحال
اس لئے یاد رکھو اور خوب سمجھ لو کہ یہ جو سوز و غم تمہارے قلب کو کھائے جارہا
ہے، یہ نتیجہ ہے تمہارے اعمال بد کا، مثلاً جب تم کسی کو دیکھتے ہو کہ وہ تم کو
ناحق آزار پہنچا رہا ہے، بے وجہ تکلیف دے رہا ہے از بردستی ستا رہا ہے۔
تو ذرا سوچ کر دیکھو کہ کیا تم نے بھی اسی قسم کی حرکت کسی معصوم و مظلوم کے
ساتھ نہیں کی تھی، جس نے تم کو کوئی تکلیف نہیں پہنچائی تھی! ممکن ہے کہ
فوراً یاد نہ آئے، لیکن تحت الشعور نفس کی گہرائیوں میں یہ واقعہ ضرور مندرج
ہے وہ ایک روز تمہارے غور و فکر کرنے پر ظاہر و باہر ہو جائے گا، ہر حادثہ
اور مصیبت کے وقت اسی قسم کی سوچ بچار سے کام لیا جائے اور دیانت
داری کو ہاتھ سے نہ دیا جائے تو آدمی بالآخر اس امر کا قائل ہو جاتا ہے،
کہ اللوم علی لاعلیھم ملامت مجھ پر ہے، میرے دشمنوں پر نہیں، کیونکہ
حقیقی معنیٰ میں میرا دشمن کوئی نہیں، میں ہی اپنی ذات کا بڑا دشمن ہوں اور دوسرے
دشمن، میرے ہی طبیعت کے پیدا کردہ ہیں، ؎

زادۂ طبع من اند آنانکہ خصمان من اند

(خاقانی)

اور حضور انور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ارشاد کی جان و دل سے تصدیق
کرنے لگے گا کہ اعدی عدولک نفسک التی بین جنبیک تیرا سب سے
بڑا دشمن تیرا وہ نفس ہے جو تیرے دونوں پہلوؤں میں ہے! درد

والم تیرے ہی ہاتھوں کی کمائی ہے ۔ یداك کسبتا وفوك نفخ ۔[۱]

جو مصیبت و آفت، درد و غم، گناہوں کی عقوبت کے طور پر وارد ہوتے ہیں، ان کی پہچان بس یہی ہے کہ انسان تزدلی بلا پر صبر نہیں کرتا، اپنی جیسی بے بس و بیکس ہستیوں کی طرف اپیل کرتا ہے جزع و فزع کرتا ہے شکوں اور بتوں کا دفتر کھول دیتا ہے، مقام شکوے میں داخل ہو جاتا ہے اور مقام صبر سے خارج ہو جاتا ہے، مصیبت کے دفع کرنے کا واحد علاج یہی ہے کہ اپنے اعمال کی اصلاح کی جانب توجہ کرے، اپنے نفس کا تزکیہ کرے، قلب کا تصفیہ کرے، اپنے سر کا اوہام باطلہ سے تخلیہ کرے، خیر کی جانب لوٹے، نور کی طرف پلٹے، ظلمتوں سے نکل جائے، غم و الم کی تاریکیاں خود بخود دور ہو جائیں گی اور راحت و مسرت کا نور اس کی رگ و پے میں سرایت کرنے لگے گا ۔

درد و غم وہ اشارات ہیں جو انسان کو اس کے اعمال کی جانب متوجہ کرتے ہیں، یہ خیر کی طرف ہدایت کرتے ہیں ۔ ان کا وجود اس پر اسرار کائنات میں بے معنیٰ نہیں، شر محض نہیں ۔ یہ خیر کے تحقق کا زبردست آلہ ہیں، خیر کی منزل تک لے جانے کا نہایت قوی ذریعہ ہیں، یہ جرائم و معاصی کی ظلمتوں کو رفع کرنے میں نور کا کام دیتے ہیں، ایک لفظ میں یوں کہو کہ یہ خام کو پختہ بنانے کے لئے ضروری ہیں، اقبال رحمہ نے اسی مفہوم کو یوں ادا کیا ہے،

جہاں ما کہ جز انگارۂ نیست ۔۔۔ اسیر انقلاب صبح و شام است
ز سوہانِ قضا ہموار گردد ۔۔۔ ہنوز ایں پیکرِ گل ناتمام است

سوہانِ قضا پیکرِ خاکی کے نقص و تحدید کو، کجی و خامی کو، غم و الم کے انگارہ سے دُور کرتا جاتا ہے، اور اس کو کمال کی طرف کھینچ لاتا ہے!

(۲) بعض دفعہ درد و الم، سوز و غم، معاصی و جرائم کی عقوبت کے طور پر نہیں عائد کئے جاتے، مقصود محض سزا دینا نہیں ہوتا، بلکہ تطہیر ہوتی ہے "تکفیر و تمحیص ہوتی ہے، شہوتوں و لذتوں کے اتباع سے نفس میں تاریکی پیدا ہوتی ہے، اوامرِ الٰہی کی مخالفتوں سے قلب مردہ ہو جاتا ہے، درد و غم، سوز و الم نفس سے ظلمتوں کو دُور کرتے ہیں، مردہ قلب کو جلاتے جگاتے ہیں، حق تعالیٰ کی طرف اس کا رخ پھیرتے ہیں، جو نورِ مطلق ہیں، وہ ان کی طرف رخ کر کے نورانی ہو جاتا ہے، اور گناہوں کی ساری تاریکیاں دور ہو جاتی ہیں، بلاؤں اور مصیبتوں سے نفس دب جاتا ہے، ذلیل و خوار ہو جاتا ہے حق تعالےٰ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ شہوتوں اور لذتوں سے ٹوٹ کر ان سے جڑ جاتا ہے، ربط قائم کر لیتا ہے، غم سے زیادہ مؤثر تطہیر کے لئے کوئی اور شئے نہیں، اور بلا آتی ہے اسی تطہیر کی خاطر۔ ع

این بلائے دوست تطہیر شما است (رومیؒ)

اسی مقصود کے پیشِ نظر عارف رومؒ درد و غم (قبض) سے رنجیدہ نہ ہونے کی تاکید فرماتے ہیں، اور اس کو سالک کے لئے مفید قرار دیتے ہیں۔

چونکہ قبض آمد تو در وے بسط بیں تازہ باش و چیں میفگن بر جبیں

چونکہ قبضے آیدت اے راہ رو آں صلاح تست آیس دل مشو

اس خیال سے صوفیائے کرام نے بلا و مصیبت کو حق تعالےٰ کے

انعامات سے بہتر قرار دیا ہے، آلام محبوب بہ از انعام محبوب، بلا ہی عطا ہے اور عطا پر غم کیسے؟ بلا از دوست عطا است وز عطا نالیدن خطا است،

کے ز آزار تو بیزار شود عاشق مسکین ❊ زخم چوں از تو رسد با ہمہ آزار خوشیم

(منصور حلاج)

بلاو غم جب تکفیر و تمحیص کے لئے آتے ہیں تو اس کی صاف علامت یہی ہے کہ مبتلا جزع و فزع نہیں کرتا، صبر جمیل سے کام لیتا ہے، دوستوں اور ہمسایوں کے سامنے اپنی مصیبت کو پیش کر کے شکوہ و شکایت نہیں کرتا، صبر کرکے بے حساب اجر کا امیدوار رہتا ہے۔

(۳) اور بعض دفعہ بلا و مصیبت محض تطہیر و تکفیر کے لئے بھی نہیں آتی بلکہ ارتفاع درجات اور بلوغ منازل عالیات اس کا مقصد ہوتا ہے، یہ قانون اہل اللہ کے متعلق ہے، جنہوں نے اپنے نفس کا تزکیہ کر لیا ہے، جن کے قلوب پاک و مصفّٰی ہیں، جنہیں ربط بحق قائم ہے، دیکھا جاتا ہے کہ کثرت سے بلائیں ان ہی پر نازل ہوتی ہیں، چنانچہ البلاء للولاء، بلا دوستوں کے لئے ہوتی ہے، مشہور خاص و عام یہی ہے، اس قانون کو راز دان حقیقت صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں بیان فرمایا ہے،

اذا احب اللہ عبدا ابتلاہ فان صبرا جتباہ وان رضی اصطفاہ

یعنی جب حق تعالیٰ بندے سے محبت کرتے ہیں تو اس کو مصیبت میں مبتلا کرتے ہیں، اگر وہ صبر کرے تو اپنا پسندیدہ بنا لیتے ہیں، اور اگر راضی رہے تو برگزیدہ قرار دے لیتے ہیں، اسی لئے حضرت معروفؒ فرمایا کرتے تھے،

لیس بصادق فی دعواہ من　　　　جو اپنے مولا کی مار سے لذت نہیں لیتا

لم یتلذذ بضرب مولاہ۔　　　　وہ سچا غلام ہی نہیں۔

اس مفہوم کو کسی عاشق نے ان سریلے نغموں میں ادا کیا ہے۔

جاں بلب آمدم ز درد و کردمش از وے طلب　　　　گفت اگر تو عاشقی صبر کن و رضا طلب

بار دگر کہ بر سرت تیغ زنند تو دم مزن　　　　سر بفدائے یار کن ہیچ نخوں بہا طلب

موئے سرا ہر بار شو تا شود او بکام تو!

قابل التفات نیست عاشق مدعا طلب

انسان کی فطرت کے اقتضاءات و قابلیات کا جن کو حکیمانہ علم حاصل ہے، وہ اس راز کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ منازل عالیہ تک رسائی کے لیئے درد و غم لابدی و لازمی ہے، تقیید جو انسان کی فطرت ہے، اطلاق کے کسی درجہ کی متحمل نہیں ہو سکتی، درد و الم ہی سے رفتہ رفتہ اضافی اطلاقیت پیدا ہوتی جاتی ہے، یہ اطلاقیت کیا ہے، نفس کی تحدیدات سے رہائی ہے، ذمائم اخلاقیہ تحدید ہی کا نتیجہ ہے، صفاتِ حسنہ کا پیدا کرنا مشقتوں کا برداشت کرنا ہے، تحمل مشاق موجب الم ہوتا ہے، لیکن ایک دفعہ جب صفاتِ حسنہ پیدا ہو جاتے ہیں، تو انسان ترقی محسوس کرنے لگتا ہے۔ اور ہزاروں غموں سے نجات پاتا ہے، گو درد و غم کو وہ فطرتاً مکروہ سمجھتا ہے لیکن نتائج سے واقف ہونے کے بعد وہ حق تعالیٰ کے اس قول کی تصدیق کرنے لگتا ہے کہ:—

عسیٰ ان تکرھوا شیئا　　　　یعنی شاید تم کسی چیز کو برا جانو اور اللہ تعالیٰ نے

ویجعل اللّٰہ فیہ خیرا کثیرًا   اس میں خیر کثیر رکھی ہو۔

اولیاء پر جو بلائیں نازل ہوتی ہیں وہ ان کے درجات کے ارتفاع کے لئے ہوتی ہیں، حق تعالیٰ انہیں اپنا قرب عطا کرتے ہیں، فقر و نیستی میں انہیں مبتلا کرتے ہیں، درد و حزن ان پر طاری کرتے ہیں، ان سے ارشاد ہوتا ہے کہ البلاء کنز من کنوز الجنۃ لا یعطی الا باولیاءہ۔

عشاق بلا کی اہمیت و نیت سے واقف ہوتے ہیں مستانہ وار وہ اس کے طالب ہوتے ہیں کہ

درد و قدح دردکہ آں می یابد   در دیکہ زلست بیشتر مے یابد
نعمت عجب لیک ہے خوشخوار است   ہر چند ہمی خورم دگر مے یابد

کبھی وہ اپنے ساتھیوں کو یہ کہہ کر تسکین دیتے ہیں:-

بفقر و نیستی یک دو روزہ خوش می باش
کہ یار خود ز کرم عذر خواہ مے گردد!

ان کے نزدیک جان کے مقابلہ میں تن کی زیادہ قدر نہیں اور جان کی قدر بزگوئے جاناں" کی وجہ سے ہے، تن اگر تکلیف میں ہو، لیکن جان جاناں کے مطابق ہو اور اس کے جمال سے کیف اندوز، تو پھر تن کی تکلیف کی کیا شکایت اسی لئے بلا میں یہ عوام کالانعام کے خلاف۔

(۱) کسی غیر کے آگے شاکی نہیں ہوتے اور اپنی تنگ دلی کا کسی کے سامنے اظہار نہیں کرتے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ انہم لن یغنوا عنک من اللّٰہ شیئًا

ستم کشان محبت دم از فغاں بستند   گرہ ز جبہ کشادند و بر زبان بستند

(۲) اپنے باطن میں اتہام اپنے رب پر نہیں رکھتے، اس کی حکمت بالغہ میں انہیں کوئی شک نہیں ہوتا، وہ حق تعالےٰ سے یہ خطاب سنتے ہیں،

بادر دلبار چوں دوائے تو منم   در کس منگر کہ آشنائے تو منم
گر بر سر کوئے عشق ما کشتہ شوی   شکرانہ بدہ کہ خون بہائے تو منم

(۳) انہیں یقین کامل ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ نے جو بات ان کے لئے اختیار کی ہے وہی ان کے لئے دین و دنیا میں اچھی ہے، ع

صلاح ما ہمہ آنست کاں ترا است صلاح

"حدیث الولی" میں اس آخری [illegible] کو پوری وضاحت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ میرے بندوں میں کوئی ایسا بھی ہے کہ تونگری یا غنا کے سوا کوئی چیز اس کو صالح نہیں کر سکتی اگر میں اس کو فقیر کر دوں تو یہ فقر اس کے ایمان کو بگاڑ دے، اور کوئی ایسا بھی ہے کہ اس کو فقیری و درویشی کے سوا کوئی چیز نیک نہیں بنا سکتی، اگر میں اس کو غنی کر دوں تو غنا اس کے ایمان کو فاسد کر دے، اور کوئی ایسا بھی ہے کہ اس کو صحت و تندرستی کے سوا کوئی چیز درست نہیں رکھ سکتی، اگر میں اس کو بیمار کر دوں تو وہ بیماری اس کے ایمان کو بگاڑ دے، اور کوئی ایسا بھی ہے کہ بیماری کے سوا کوئی چیز اس کے ایمان کو درست نہیں رکھ سکتی اگر میں اس کو تندرست رکھوں تو یہ تندرستی اس کے ایمان کو فاسد کر دے مجھے اپنے بندوں کے احوال سے پوری آگاہی ہے اور میں ان کے مطابق اپنا کام کرتا ہوں۔

حق تعالیٰ کی ان ہی حکمتوں سے واقف ہو کر عشاق ان کی حسن تدبیر، قضا و اختیار سے راضی اور مطمئن رہتے ہیں اور ہر حال میں رضا بالعطاء، اور "حفظ حال" ضروری سمجھتے ہیں، اور قلب کی گہرائیوں سے ع

ہر چہ از دوست می رسد نیکوست

کے قائل ہوتے ہیں، اسی لئے گو وہ "طبعی" غم و اندوہ میں مبتلا ہوتے ہیں، لیکن "عقلی سرور" سے ان کے قلب خالی نہیں ہوتے، یہ ہے "جمع بین الاضداد" اور "ضدوں کی جمع کا یہ ہنر" ان ہی کو آتا ہے، رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ!

غرض طبعی حزن و غم کے لحاظ سے کلیہ یہ ہے کہ ع

عالم ہمہ درد است و دوا می خواہد

یہ درد یا تو گناہوں اور بد کرداریوں کا نتیجہ ہے، یا تطہیر و تکفیر کے لئے وارد ہوتا ہے، یا رفع درجات کے واسطے عاید کیا جاتا ہے، بہر حال،

لقد خلقنا الانسان فی کبد — ہم نے انسان کو بڑی مشقت میں پیدا کیا۔ (پ ۱۵ ع ۲۰)

کے کلی قانون کا کوئی استثناء نہیں دکھائی دیتا، انسان کی ساری عمر محنت اور دکھ، غم و اندوہ میں گزرتی ہے، سوز و الم میں بسر ہوتی ہے، وہ ایک موج بیقرار کے مانند ہے، جس کی ماہیت ہی میں پیچ و تاب ہے، چنانچہ اقبال نے اس حقیقت کو خوب بیان کیا ہے،

چہ پرسی از کجا یم چیستم من؟ — بخود پیچیدہ ام تا زیستم من
دریں دریا چو موج بیقرارم — اگر برخود نہ پیچم نیستم من

لیکن جیسا کہ اُوپر واضح ہو اور وہ غم سوز و الم بے معنی نہیں، بغیر مقصد و غایت کے نہیں، اس کا مقصد خودی کی تعمیر ہے، قوت حیات کی توفیر ہے، اسی مقصود کو پیش نظر رکھنے سے انسان کو طبعی درد کی حالت میں بھی عقلی سرور حاصل ہو سکتا ہے، یعنی اس کو اپنی جہت سے غم ہی غم ہے الیکن حق تعالیٰ کی جہت سے سرور ہی سرور اسی نکتہ کو سمجھ کر عارف رومی نے فرمایا تھا ؎

چوں بدانستی کہ ظلِ کیستی　　فارغی گر مردی و گر زیستی
قطرۂ نوری سراپا نور باش　　بگذر از غم دائما مسرور باش

فافہم وتدبر!

علاجِ حزن[1]

(مسلسل)

یہ مقالہ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے بارھویں اجلاس سنہ ۲۰ء میں پڑھا گیا تھا

اگر غم را چو آتش دود بودے — جہاں تاریک بودے جاودانہ

دریں گیتی سراسر گر بگردی — خردمندے نیابی شادمانہ

(شہید بلخی)

غم نتیجہ ہے احتیاج کا اور انسان سرتاپا احتیاج ہے لہٰذا انسان غم کا پتلا ہے۔ لقد خلقنا الانسان فی کبد، رفع احتیاج ہی کے لئے وہ شب و روز حیران و سرگردان رہتا ہے، تمام اسباب و علل کو کام میں لاتا ہے، درد کی دوا چاہتا ہے، احتیاج کا سلسلہ لامتناہی ہوتا ہے، ایک احتیاج کی

---

[1] معارف میں بعنوان "زندگی میں غم کیوں ہے" کے عنوان سے جنوری سنہ ۲۲ء میں شائع ہوا

تشفی ہوتی ہے تو دُوسری پیدا ہو جاتی ہیں، اور غم و الم برابر جاری رہتا ہے، لہٰذا کلیہ یہ قرار پاتا ہے :-

عالم ہمہ در و ست درد وا می خواہد　　　از خزانِ کرم برگ و نوا می خواہد
کس بے حاجت نمی تواند دیدن　　　درویش غذا شہ اشتہا می خواہد

(سمائی استرآبادی)

اس کلیہ کا استثنا الشاذ کالمعدوم کا حکم رکھتا ہے، جس کسی سے پوچھئے "سامانِ دِل چیست ؟" جواب ملے گا، "درونِ سینہ سوزے و تفے" اگر پوچھا جائے "تن چیست ؟" کہے گا :- "غم و رنج و بلا راہدفے" کسی اور سوال کا انتظار کئے بغیر خود کہہ اٹھے گا، القصہ بہ قصدِ جان ہا لبستہ صفے، مرگ از طرفے و زندگی از طرفے،

دِل چیست ؟ درون سینہ سوزے تفے　　　تن چیست ؟ الم و رنج و بلا را ہدفے
القصہ بہ قصد جاں ہا لبستہ صفے　　　مرگ از طرفے و زندگی از طرفے

(سوسن یزدی)

مرضِ غم ہمہ گیر ہے، اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، لیکن یہ کلیہ بھی مسلمہ ہے کہ ہر مرض کا علاج ہے، غم کا علاج مذہب اور فلسفہ اور نفسیات نے ہمیشہ پیش کیا ہے، کچھ دیر کے لئے آپ میرے ساتھ چند نسخوں پر غور کیجئے ایک زمانہ سے میں نے ان کا اپنی ذات کے لئے اور دوسروں کے لئے بھی کامیابی کے ساتھ استعمال کیا ہے، پدرانہ نصیحت کے لئے نہیں کھڑا ہوں چند اساسی عقلی اصول کی طرف آپ کی عقلِ روشن کو متوجہ کروں گا - اگر یہ

اصول آپ کی سمجھ میں آجائیں، اور آپ ان کے استعمال پر راضی ہو جائیں تو شفایابی یقینی ورنہ تضیع اوقات کی معافی کا خواستگار رہوں، غم کا حتمی و یقینی علاج مذہب پیش کرتا ہے، اس کی تائید فلسفہ اور نفسیات سے ہوتی ہے، اس علاج کے مختلف اجزاء ہیں، پہلا جزو،

(۱) زندگی کے خیر ہونے کا یقین - اگر آپ خدا کے وجود کے قائل ہیں، (اور اسی صورت میں میرا آپ سے روئے خطاب ہے) تو آپ بھی یہ مانتے ہیں کہ خدا ہمہ خیر ہے، خیر مطلق ہے، خیر محض ہے، نیز وہ ہمہ تواں یا قادر مطلق بھی ہے، آپ کا یہ بھی یقین ہے کہ ہر شئے کا صدور خدا سے ہوتا ہے، زندگی کا مبداء خدا ہے، اس لئے زندگی کا خیر ہونا بدیہی طور پر لازم آتا ہے، اگر معاذ اللہ خدا خیر محض نہ ہوتا تو اس سے شر کا صدور ممکن تھا، اگر خیر مطلق نہ ہوتا تو سمجھا جا سکتا تھا کہ وہ خیر کے پیدا کرنے میں مجبور ہے، لیکن خدا کو خیر مطلق و قادر مطلق مان کر زندگی کے شر ہونے کا یقین کرنا نہ عقل ہی کے مطابق ہے، نہ نقل کے، بتائیے مقدمات کے صحیح ماننے کے بعد منطقی نتیجہ سے گریز کیسے ممکن ہے؟ اور مقدمات کی توثیق مذہب اور وجدان سے ہوتی ہے

ہر چہ بینی محض خیر و حکمت است | گر نہ از و رحمت و گر زحمت است
زانکہ ناید فعل باطل از حکیم | فعل حق باطل نباشد اے سلیم

یہ دلیل تو میں نے اہل عقل کے لئے دی ہے، اہل عشق جن کی صفت "یؤمنون بالغیب" ہے مبدءِ کائنات کو خیر محض مانتے ہیں اور اس کے گرویدہ ہوتے ہیں (اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰہِ) اور زندگی کے خیر ہونے کا انہیں راسخ یقین

ہوتا ہے، علاج غم کے لئے یہ ضروری ہے کہ آپ اس یقین کو پختہ کریں کہ دنیا اچھی، زندگی اچھی، زندگی کے تجربات اچھے، زندگی کے ساتھ تعاون کرنا اچھا، اس تعاون کے نتائج اچھے، انجام اچھا! اسی یقین، اسی "اللہ ہستی" "خود گزینی" کی وجہ سے آپ بیک وقت قنوطیت، یاس، غم واندوہ کے غلامی سے آزاد ہو جائیں گے! اس معاملہ میں "بے یقینی" آپ کو ہمیشہ کے لئے رنج و الم میں گرفتار رکھے گی، اقبال کی تہدید بھول نہ جائیے!

سن اے تہذیب حاضر کے گرفتار
غلامی سے بتر ہے بے یقینی

جب ہم یہ یقین کرلیں کہ زندگی اور اس کے تجربات اچھے ہیں، اور ہمیں ان سے خوشی کے ساتھ تعاون کرنا چاہیئے، اور پھر خوشی کے ساتھ تعاون کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہو جائیں تو ہم میں اور زندگی کے واقعات میں توافق پیدا ہو جاتا ہے، اور حالات خود بخود سدھرنے لگتے ہیں شادمانی و کامیابی نصیب ہوتی ہے، یہ ایک راز ہے، مذہبی زندگی کے تجربات کا جو میں آپ پر فاش کر رہا ہوں!

یہ محض ایک اعتقادی بات نہیں ہے، بلکہ مسئلہ نفسیاتی اصول پر اس کی بنیاد قائم ہے، خیالات کا اثر افعال پر ہوتا ہے، اور افعال ہی آثار میں تغیر پیدا کرتے ہیں، قنوط و یاس خوف و حزن پیدا کرتے ہیں، اور یہ وہ سلبی جذبات ہیں جو قوائے عملی کو مفلوج بناتے ہیں، خیالات اور جذبات اگر سلبی ہوں تو سیرت اور قسمت کے سیہ رو ہوے میں باقی کیا رہتا ہے کیوں کہ نفس کا

یہ ایک ہمہ گیر قانون ہے کہ خیالات ہی سے مقاصد کی تشکیل ہوتی ہے، مقاصد اعمال میں ظہور پذیر ہوتے ہیں، اعمال عادات کا تعین کرتے ہیں، عادات کی ترتیب و تنظیم سے سیرت بنتی ہے اور سیرت ہی تو قسمت ہے انسان کی زندگی میں وہ دن نہایت ہی مبارک ہوتا ہے جب اس کو اس امر کی یافت ہوتی ہے کہ وہ خود ہی اپنی قسمت کا بنانے اور بگاڑنے والا ہے، اس کی ذات ہی میں اس کے آلام کے اسباب پنہاں ہیں اور وہیں راحت و شادمانی کے علل کا نشان ملتا ہے۔ آفات کے نزول پر خدا کو ظالم اور اپنی ذات کو مظلوم ٹھیرانا نہ صرف الحاد ہے، بلکہ کج فہمی اور بیوقوفی بھی، جب تم خدا کو ہمہ خیر مان کر تمام اچھی صفات سے متصف کرتے ہو تو پھر اس کی طرف ظلم کی نسبت کیسے ہو سکتی ہے اور خدا ظالم بن کر لائق عبادت کیسے ہو سکتا ہے؟ اور جو لائق عبادت و استعانت نہ ہو وہ خدا کیسے ہو سکتا ہے۔ اب اگر خدا پر یقین باقی رہ سکتا ہے تو صرف اسی صورت میں کہ خدا کو ظالم نہیں عادل مانا جائے۔ اب ظلم کی نسبت ہمیں اپنی ذات کی طرف کرنی پڑے گی اور اسی کو تمام مصائب و آلام کا مبدء قرار دینا پڑے گا ما اصابک من حسنة فمن الله وما اصابک من سيئة فمن نفسک۔

ان حقائق کے سمجھ لینے کے بعد تم جرأت کے ساتھ یقین کرو کہ دنیا اچھی، زندگی اچھی اور اس کے واقعات و تجربات اچھے نقص، کجی، یا شر کہیں ہے، تو تمہاری ہی ذات میں ہے، مصائب کے نزول کے وقت قضا و قدر پر اعتراض نہ کرو، بلکہ توافق بالقضا سے کام لو، اس احساس کو قلب میں نہ

آنے دو کہ تم پر ظلم ہو رہا ہے، اور تم قابلِ رحم ہو، کیوں کہ اس احساس کے
ساتھ ہی تم خدا کو ظلم سے متصف کرنے لگو گے، اور اپنے کو بے خطا و بے
قصور قرار دو گے، اور تم نے دیکھا ہے کہ واقعہ ہمیشہ اس کے خلاف ہوتا ہے
اپنی ذات کو بے خطا و بے قصور سمجھنا جب کہ وہی تمام سوء کا مبدء ہو کس قدر
عظیم الشان مغالطہ ہے، ایسی صورت میں کیا اصلاحِ نفس کی گنجائش بھی
باقی رہتی ہے؟ کیا ترقّی کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند نہیں ہو جاتا؟ جو شخص
اپنی ہی جان پر ترس کھا رہا ہو، اپنی ہی قسمت پر آنسو بہا رہا ہو، اپنی ہی تقدیر
کی شکایت میں ہمیشہ مصروف رہتا ہو اور ساری دنیا کو اپنا مخالف سمجھتا
ہو، میرے نزدیک اس قابل ہے کہ کوہِ ہمالیہ کی چوٹی سے نیچے گرا دیا جائے
تاکہ اس کو بھی نجات ملے اور دنیا بھی خس و خاشاک سے پاک ہو جائے
اقبال ایسے ہی بد بخت سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔

از جورِ چرخِ ناہنجار تنگ   جامِ تو فریادیِ بیدارِ سنگ
نالہ و فریاد و ماتم تا کجا   سینہ کوبی ہائے پیہم تا کجا
در عمل پوشیدہ مضمونِ حیات   لذّتِ تخلیق قانونِ حیات
خیز و خلّاقِ جہانِ تازہ شو   شعلہ در بر کن خلیل آوازہ شو
با جہانِ نامساعد ساختن   ہست در میداں سپر انداختن
گر نہ سازد با مزاجِ او جہاں   می شود جنگ آزما با آسماں
بر کند بنیادِ موجودات را   می دہد ترکیبِ نو ذرّات را
می کند از قوتِ خود آشکار   روزگارِ نو کہ باشد سازگار!

در جہاں نتواں اگر مردانہ زیست ہمچو مرداں جاں سپردن زندگیست

یقین کی اساس قائم ہونے کے بعد عمل کی مشید عمارت اٹھائی جانی چاہیئے ۔ اب ہم تک نے اس امر پر زور دیا کہ یقین درست کرنا چاہیئے، یقین کی زندگی اچھی چیز ہے اور زندگی کے واقعات و تجربات اچھے ہیں، ہاں کے ساتھ تعاون ضروری ہے، یہ علاج غم کے نسخہ کا پہلا جزو تھا۔ اس کا دوسرا جزو عمل ہے، جس کو زندگی کے ساتھ تعاون کہا جا سکتا ہے ۔

(۲) **عمل** :۔ مبدء غم احتیاج، احتیاج کا دفعیہ عمل ہی سے ممکن ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ عمل ہمیشہ کامیاب ہی ہو اور ساری احتیاجات کو رفع کر سکے عمل کو کامیاب بنانے اور ناکامی کی صورت میں غم و اندوہ سے متاثر نہ ہونیکا بھی کوئی طریقہ ہو سکتا ہے؟ بات بڑی آسان ہوتی اگر انسان کی ساری احتیاجات عمل سے رفع ہو جاتی ہیں، اور وہ محض چین و راحت کی زندگی بسر کر سکتا ہے، عمل کے دو ہی نتائج ہو سکتے ہیں کامیابی یا ناکامیابی عام طور پر فطرت کا یہی اصول ہے کہ مجاہد کے آگے دنیا اپنا سر جھکاتی ہے مجاہد خطرہ ہی کی کو حقیقی معنی میں زندگی سمجھتا ہے، ع

اگر خواہی حیات اندر خطر زی

ناکامی سے یہ مایوس ہو کر نالہ و فریاد، سینہ کوبی اور ماتم نہیں کرتا، کیوں؟ اس کے چند تیقنات و عقاید ہیں، ان ہی کی تحلیل سے علاج غم کے دوسرے جزو کی تشریح ہو جائیگی ۔

مجاہد زندگی کو جہاد اکبر سمجھتا ہے، دشمنوں سے جنگ اور میدان کارزار کا

جدال و قتال اس کے نزدیک "جہاد اصغر ہے" اس کا بنیادی یقین یہ ہوتا ہے کہ حق بالآخر کامیاب ہوگا، اور باطل کو شکست ہوگی، چونکہ وہ ہمیشہ حق کے غلبہ و استیلاء کے لئے جہاد کرتا ہے اس لئے اس کو یقین ہے کہ خدا سے نصرت و تائید کا پانا اس کا حق ہے، کان حقاً علینا نصر المومنین اس وعدہ اور یقین کی وجہ سے "احساس کمتری" یک لخت اس سے مفقود ہو جاتا ہے، اب وہ کامیابی کے یقین کی ناقابل مدافعت قوت کے ساتھ عمل کرتا ہے اس کا ایمان ہوتا ہے کہ تمام حول و قوت من اللہ ہے لا حول و لا قوۃ الا باللہ، وہ صرف اللہ ہی کو فاعل اور موثر حقیقی سمجھتا ہے اور خود کو امین و خلیفہ قوت و اثر و حرکت میں وہ اللہ ہی سے استعانت کرتا ہے اور اسی کے سامنے سر عبودیت خم کرتا ہے، ذل و افتقار کی اسی سے نسبت رکھتا ہے، عبادت و استعانت میں وہ اپنی نسبت صرف اللہ ہی سے رکھتا ہے اور فانی عن الخلق ہوتا ہے، یعنی نہ مخلوق سے استعانت طلب کرتا ہے اور نہ ان کے سامنے سر نیاز جھکاتا ہے کفی باللہ وکیلا اس کا ماٹو ہے فاتخذہ وکیلا۔ اس کا اصول عمل قل اللہ ثم ذرھم اس کا طریقہ کار حسبی اللہ اس کا راحت جان کلمہ، ایک لفظ میں وہ موحد ہوتا ہے، اور لا الہ الا اللہ کا مصداق و عامل۔

اس یقین و عقیدہ کی تحریک سے اس کا ہر عمل پیدا ہوتا ہے، اب جیسا کہ ہم نے اوپر کہا عمل کے دو ہی نتائج ہوتے ہیں کامیابی یا ناکامی' کامیابی میں "شکر" کرتا ہے کیوں کہ وہ اس راز سے واقف ہے۔

(جو ایک مسلّمہ نفسیاتی اصول پر مبنی ہے) کہ شکر سے نعمت میں اضافہ ہوتا ہے، قوّت عمل میں جوش پیدا ہوتا ہے اور تسخیر کائنات آسان ہو جاتی ہے، لئن شکرتم لازیدنکم۔ کا قطعی وعدہ اس کو مسرور کرتا ہے، وہ اس کامیابی اور نعمت کو خدا کی جانب سے سمجھتا ہے اور خلق کی طرف اسکی نسبت نہیں کرتا گو خلق ہی کے ہاتھ سے نعمت ملتی ہے، لیکن یہ محض بمنزلہ اسباب و آلات و ادوات نعمت ہوتے ہیں، قاسم و مجری و موجد و فاعل و مسبب صرف اللہ ہی ہوتا ہے اسی لئے وہی شکر کا مستحق ہے، مثلاً جب تمہیں تمہارا کوئی دوست ہدیہ بھیجتا ہے تو تمہاری نظر اس خادم کیطرف نہیں جاتی جو یہ ہدیہ تمہارے یہاں سے کر آیا ہے، بلکہ اپنے دوست کے تم شکر گذار ہوتے ہو، جس نے تمہیں یہ بھیجا ہے منعم حقیقی اللہ ہے۔ العاطی للہ۔ وما بکم من نعمۃ فمن اللہ اس ادراک سے نعمت زوال کے خطرہ سے آزاد ہو جاتی ہے، یہ ایک عظیم الشان حکمت ہے، جس کو بصیرت محمدیہ نے بنی نوع انسان کے سامنے پیش کیا ہے۔ اس راز کو ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے!

النعمۃ وحشی نقیدھا بالشکر۔	نعمت ایک وحشی جانور ہے شکر کی زنجیروں سے اس کو باندھو۔

یہ تفسیر ہے باری تعالیٰ کے اس قول کی کہ
لئن شکرتم لازیدنکم۔

مجاہد جب اپنی جدوجہد میں ناکام ہوتا ہے تو یاس و حزن، خوف والم کا شکار نہیں ہو جاتا، کیوں؟ اس لئے کہ وہ کائنات کے ایک قدیم راز سے

واقف ہوتا ہے جو دفع غم کے لئے اکسیر ہے، اور جس کو "بصیرت محمدیہ" نے دریافت کیا ہے، وہ کیا ہے؟ یہی کہ بلاؤں پر صبر کرنے سے بلائیں نعمتوں میں مبدّل ہو جاتی ہیں، ذرا نفسیاتی نقطہ نظر سے اس قانون پر غور کرو، مصائب کے نزول کے وقت صبر سے بہتر کوئی اور پہلو ذہن اختیار بھی کر سکتا ہے؟ حزن و یاس سے قوائے عمل مفلوج ہو جاتے ہیں، مصیبت کے مقابلے اور برداشت کی قوت فنا ہو جاتی ہے، تردّد و فکر بھی عمل کے قاتل ہیں، تشتت اور پریشانی کو بڑھاتے ہیں، "گلہ و شکوہ" تو نامردی کی صریح علامت ہے "کلبیت" استہزاء و استخفاف غم کی دوا نہیں، بلاؤں کے نزول کے وقت جب انسان حق تعالےٰ کی گذشتہ عطاؤں کو یاد کرکے صبر کر لیتا ہے تو حق تعالیٰ اس کے قلب کی حفاظت کر لیتے ہیں، مستغنی کر دیتے ہیں، اب بار غم سبک ہو جاتا ہے، برداشت کی قوت بڑھ جاتی ہے، اور وہ انہی بلاؤں میں عطاؤں کو پاتا ہے۔

خود بلاء و ابتلا کی ماہیت کے متعلق مجاہد صحیح علم رکھتا ہے، ہر بلا ایک اخلاقی سبق دینے آتی ہے، یہ ہمارے کسی نہ کسی نقص کو دفع کرتی ہے اور اخلاقی اعصاب کو قوی کرتی ہے، سیرت میں پختگی پیدا کرتی ہے۔ اس طرح ہمارے مراتب بلند کرتی ہے اور درجات میں ترقی دیتی ہے۔ یہ بظاہر شر ہے، لیکن دراصل خیر کے تحقق کا ایک ناگزیر ذریعہ ہے، زندگی ایک مدرسہ ہے، واقعات زندگی کے ذریعہ معلّم حقیقی ہمیں ہر روز سبق دے رہا ہے اگر ہم میں عقل ہے تو ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہماری ہر ناکامی میں بھی ایک

حکمت ہے اور ایک خاص عظمت سوائے اس ناکامی کے تجربہ کے دنیا کی کوئی اور شئے نہیں نہ یہ درس حکمت دے سکتی ہے اور نہ عظمت کے اس درجہ پر فائز کرسکتی ہے، ہر غلطی جو تم سے سرزد ہوتی ہے، ایک اہم سبق سکھاتی ہے۔ اگر تم اس کی تحقیق کرو اور جو شخص کہ اس شئے میں جو بظاہر شر معلوم ہوتی ہے خیر کو دریافت کرنے کی کوشش کرتا ہے، وہ واقعات کا محکوم نہیں حاکم ہے، ناکامی اس کے لئے ایک صبار فتار مرکب ہے، جو اس کو بہترین کامیابی تک پہنچاتا ہے۔

بلا کی شدت اگر تمہیں بالکل ہی مغلوب کرلے، اور اس کے خیر اور فائدے کے جذبے سے مستفید ہونے کے قابل نہ رکھ سکے، تو پھر تمہیں صبر ہی کے دامن میں سکون ملے گا، اور صرف مذہب ہی تمہاری دلجوئی کرے گا، ان وعدوں اور بشارتوں پر غور کرو جو مومن صابر کے حق میں وارد ہوئی ہیں، اگر تم میں ایمان ہے اور ایمان کا ذوق بھی موجود ہے تو یقیناً تمہارا غم ہلکا ہوجائے گا، صابر خدا کا محبوب ہوتا ہے، إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الصَّابِرِيْنَ۔ دردمند صابر خدا کی معیت کا ادراک کرتا ہے، کیوں کہ ان اللّٰہ مع الصابرینَ اس امر کا یقین کہ خدا میرے درد و غم سے واقف ہے، کیونکہ وہ میرے ساتھ ہی ہے، غم کی چبھن کو کم کردیتا ہے، اور وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا کا حکم اور بشارت تو اس کو رقص میں لے آنے کے لیئے کافی ہے مشہور ہے کہ کسی عاشق پر سر بازار ۹۹ تازیانے لگائے گئے اور اس نے آہ تک نہ کی، جب سواں تازیانہ لگا، تو اس نے آہ کرنی شروع کی! پوچھا

گیا کہ اس آخری تازیانے پر آہ و بکا کیسی؟ کہا جس کے سبب مار کھائی ہے وہ ۹۹ تازیانوں تک یہاں تماشائیوں میں موجود تھا، اور میری حالت دیکھ رہا تھا، اس لئے مجھے کچھ بھی درد محسوس نہ ہوا، آخری تازیانے کے وقت وہ چلا گیا، اور اس وقت میں نے درد محسوس کیا۔ ؎

باورد لبان چوں دوائے تو منم — در کس منگر آشنائے تو منم
گر بر سر کوئے عشق ما کشتہ شوی — شکرانہ بدہ کہ خون بہائے تو منم

(جامیؒ)

صبر پر استقامت پیدا ہو جائے تو تسلیم و رضا کا آخری مرتبہ حاصل ہو جاتا ہے، اب مجاہد صاف طور پر یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ بلا از دوست عطاست و از عطا نالیدن خطاست البلاء کنز من کنوز الجنۃ لا یعطی الا باولیاء کی وہ تصدیق کرنے لگتا ہے، اب نہ شکوہ شکایت ہی کا امکان باقی رہتا ہے اور نہ جزع و فزع کا،

ستم کشانِ محبت دم از فغاں بستند
گرہ ز جبّہ کشادند بہ زباں بستند

پیچ ہے درد و غم کا قطعی علاج تسلیم و تفویض ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں ؎

تسلیم نمی شوی از اں غم گیتی،
تسلیم شو ہر آں چہ آید پیشت،

رضا بالقضا اور حفظ حال سے نہ صرف غم ہی دور ہو جاتا ہے، اور

فرح و سرور کے دروازے کھل جاتے ہیں بلکہ حق تعالیٰ بھی تعلّی راضی ہو جاتے ہیں اور جانتے ہو کہ ان کی رضامندی کا کیا نتیجہ ہوتا ہے؟

آنانکہ رضائے حق بجاں می جویند | در راہ رضائے او بسر می پویند
ہر یک ہمہ آں کنند کہ حق فرماید | حق نیز ہماں کند کہ ایشاں گویند

قال علیہ السلام انّ اللہ رجالاً یرضیٰ برضائہم ویغضب بغضبہم کما انّہم یرضون برضاءہ ویغضبوا بغضبہ

ہر چہ خواہی آن کند گر ہر چہ خواہد آں کند
انچہ گوئی بشنود گر ہر چہ گفت او بشنوی

اے درد! تو بھی کیا لذت ہے! تری برداشت نے مجھے کیا سے کیا کر دیا ہے

دردہ قدح درد کہ آں می باید | درد یکہ زلذت بہشتر باید
تلخ است عجب لیک بسے خوش خوار است | ہر چند ہمی خورم دگر می باید!

علاجِ غضب[1]

یہ مقالہ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے چودھویں سالانہ اجلاس
نومبر ۴۲ء میں پڑھا گیا

تا توانی خستہ مگرداں کس را — بر آتش خشم خویش مستاں کس را
گر راحت جاوداں طمع میداری — می رنج ہمیشہ و مرنجاں کس را

(عطار)

انسان کی مادی اور روحانی ترقی میں جو شے سب سے زیادہ مانع و مزاحم نظر آتی ہے، وہ جذبۂ غضب ہے۔ اس آتش فشاں جذبہ کے اشتعال کے وقت انسان انسان نظر نہیں آتا، بلکہ وہ ایک مہیب غار کا منظر پیش کرتا ہے جو دخانی آگ سے پُر ہے جس میں سوائے خوفناک آوازوں اور دھواں بھاپ چنگاریوں کے کچھ نہیں نکلتا، اسی لیے اہلِ غضب اپنا نسب شیطان سے ملاتے ہیں کیونکہ اسی نے کہا تھا کہ خلقتنی من نار۔

---

[1] معارف میں "قرآن اور علاجِ غضب" کے عنوان سے فروری ۴۳ء میں شائع ہوا۔

ترا با چنیں تندی و سرکشی — نہ پندارم از خاک از آتشی

ایک غضب ناک شخص کو اعصابی تناؤ کی حالت میں دیکھ کر حضرت حسنؓ نے خوب فرمایا تھا کہ "اے شخص تو غصہ میں اتنا اچھلتا ہے کہ مجھے ڈر لگتا ہے کہ اب اس کی اچھال میں تو دوزخ میں جا پڑے گا" اس قابلِ نفرت جذبہ کے تسلّط کے وقت انسان کی صورت پاگل یا درندے کی سی ہو جاتی ہے۔ دماغ اور اعصاب سیاہ دخانات سے بھر جاتے ہیں، نورِ عقل تاریک ہو جاتا ہے خون میں زہر پیدا ہو جاتا ہے، دنیا تاریک نظر آنے لگتی ہے، اس تاریکی میں اس کو نیک و بد کی تمیز نہیں رہتی، دوستی اور محبت کے پاک رشتے قرابت و رحم کے مقدس تار، عزت و حرمت کے قیمتی روابط ایک ہی ضرب میں پاش پاش کر دیئے جاتے ہیں، تندخو کا دنیا میں کوئی دوست نہیں، پاگل اور مجنون کا کوئی دوست کیسے ہو سکتا ہے، اس کی قسمت میں سوز و تپش لکھی ہوتی ہے، اسی سوز و غم کی وجہ سے وہ اطمینانِ قلب اور طمانیتِ خاطر سے محروم ہوتا ہے اور جب قلب مطمئن نہ ہو تو بدن کیسے تندرست رہ سکتا ہے اس جہانِ فانی میں شادمانِ زندگی کے نسخے کے یہی دو اجزاء تو ہیں، صحیح و تندرست بدن اور مطمئن و آزاد ذہن، تندخو ان دونوں سے محروم! اس کے سیاہ بختی و سیاہ روئی میں کسی کو شک کیسے ہو سکتا ہے! اب سوز و تپش غم و ہم رنج و حزن کے سوا اس کے ہاں ذخیرہ کس چیز کا ہوتا ہے؟

سوز و تپش بقسمت ہر تندخو بود
برق از زبانِ حال برا جستہ جستہ گفت

غرض غضب کا جذبہ ہر برائی کی کنجی ہے (حضرت جعفر صادقؓ) بیوقوفی کی جڑ ہے، مسرت و شادمانی کا قاتل ہے ایمان سوز ہے، اور طمانیت کش، اسی لئے جب بنی نوع انسان کے محسن اعظم آنحضرت صلعم (فداہ ابی وامی) سے کسی نے درخواست کی کہ مجھے اپنی زندگی کو سنوارنے کے لئے وظیفہ عمل بتلا دیجئے۔ تو آپ نے فرمایا لا تغضب یعنی تو غصہ نہ کر، جب اس نے دوبارہ یہی سوال کیا تو یہی جواب دیا گیا، اور تیسرے مرتبہ کے سوال کا بھی یہی جواب ملا،[۱] کسی دوسرے موقع پر آپ نے ارشاد فرمایا تھا کہ حق تعالیٰ کے نزدیک کسی گھونٹ کا پینا اس قدر محبوب نہیں جس قدر کہ پی جانا غصہ کا۔[۲]

قرآن کریم نے کاظمین الغیظ العافین عن الناس کی تعریف کی ہے اور ان کے اتباع کی تحریص و تاکید۔

کیا اس خوں خوار جانفشاں جذبہ سے نجات ممکن ہے؟ علمائے نفسیات کا کیا خیال ہے؟ قرآن کریم نے کیا طریقے تعلیم کئے ہیں؟ کیا علم کی تصحیح عمل میں انقلاب پیدا کر سکتی ہے؟ کیا ریاضت و مجاہدہ غصہ کو محو کر سکتا ہے! انہی چند اعتبارات پر یہاں بحث کرنی مقصود ہے ع

ہشدار کہ رہ خود بخود گم نہ کنی؟

سقراط نے ایک ازلی صداقت کو اپنے الفاظ میں پیش کر دیا تھا کہ "نیکی علم ہے" یعنی علم صحیح ہی سے نیک عمل پیدا ہوتا ہے بشرطیکہ علم راسخ ہی

---

[۱] رواہ البخاری۔ [۲] رواہ احمد۔

کی حد تک محدود نہ رہا ہو، بلکہ قلب میں بھی اترا ہو۔ تیقن کے درجہ تک پہنچا ہو
جو شخص علم کو زبان ہی کی حد تک محدود رکھتا ہے، اس کو زبانِ سنت میں
"علیم باللسان" اور جاہل بالقلب" کہا گیا ہے" اس کا شمار ان واعظوں میں
ہوتا ہے، جن کی شکایت حافظؒ نے اپنی اس معلوم المذکر شعر میں کی ہے ؎

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند
چوں بخلوت میروند آں کار دیگر می کنند

علم صحیح بہر حال ضروری ہے، اور پھر اس کے مطابق عمل ہو تو فلاح
انسان کے ہاتھ چومتی ہے، جذبۂ غضب کی تعدیل کے لئے بھی یہ دونوں
ضروری ہیں، اس لئے ہم یہاں ان ہی دو کے متعلق دو باتیں عرض کرتے ہیں
(۱) علم صحیح: — یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ انسان کسی چیز کو محبوب رکھتا ہے۔
اور کسی چیز کو مبغوض و مکروہ، وہ محبوب چیز کے حصول کے لئے کوشش کرتا
ہے اور اس کے تحفظ کا خواہاں و متمنی ہوتا ہے اور مکروہ شئے سے بھاگتا ہے
اور اس کو دفع کرنا چاہتا ہے، یہ اس کی فطرت ہے، وہ اسی پر مجبور ہوا ہے
جب اس کی مخالفت کی جاتی ہے تو اس کو غصہ آتا ہے، بذاتِ خود غصہ
بری چیز نہیں، یہ مدافعت کا آلہ ہے، تحفظ حیات کے لئے ضروری ہے استمرار
نسل کے لئے ناگزیر ہے تنازع للبقا میں اس کا خاص مقام ہے، اس کے
بغیر ارتقا میں نسل انسانی کا بقا ممکن نہ تھا، جس طرح کائنات عناصر جی
میں عنصر نار ہی ضروری ہے، اس کے عدم سے اختلال رو نما ہوتا ہے۔
اسی طرح فطرتِ انسانی میں جذبہ غضب بھی ضروری ہے۔ اس کے

فقدان سے تباہی پیدا ہوتی ہے، موت لازم آتی ہے، اب غضب کے تین درجے ہوتے ہیں :-

(۱) تفریط :- یعنی کمی، یہ بالاتفاق مذموم ہے، ایسے ہی آدمی کو بے غیرت کہا جاتا ہے، امام شافعی رح نے کہا تھا کہ جس شخص کو غصہ دلانے سے بھی غصہ نہ آئے وہ گدھا ہے، حمیت و غضب کا بالکل نہ ہونا بھی سخت برا ہے اگر کسی شخص کی بیوی اس کے ساتھ خیانت کرے، فحش کا ارتکاب کرے، اور وہ حلم سے کام لے تو بتاؤ کیا یہ عقلاً شرعاً و عرفاً سخت مذموم نہیں؟ غصہ کا صحیح موقع پر استعمال ضروری ہے، حق تعالیٰ نے صحابہ کرام کی صفت اشداء علی الکفار قرار دی، اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم فرمایا کہ جاھد الکفار والمنافقین واغلظ علیہم، ظاہر ہے کہ شدت و غلظت غضب کے بعد رونما ہوتی ہے لہذا

قہر و لطف اندر محل خود نکوست   تا نہ گل باش و نہ خار

(۲) افراط :- یعنی زیادتی، یہ بھی بالاتفاق مذموم ہے، اسی لئے نجات کے طریقوں پر یہاں غور کیا جا رہا ہے، جب غضب عقل و دین کی سیاست و قہرمانی سے نکل جاتا ہے تو انسان درندہ بن جاتا ہے، تمام دنیوی و روحانی انوار سے محروم ہو جاتا ہے، جنون کا تسلط اس کے دماغ پر ہو جاتا ہے، اہل غضب کی فہرست میں اس کا شمار ہونے لگتا ہے، جن کے متعلق یہ کہنا صحیح ہوتا ہے کہ ؎

سایۂ جن میں یہ انسان رہا کرتے ہیں

(۳) اعتدال :- یہ درجہ محمود ہے، یہاں انسان کا غصہ عقل کے قہرمانی میں

ہوتا ہے، دین کا مطیع ہوتا، اس کے اشارہ کا منتظر ہوتا ہے جہاں حمیت شرعًا واجب ہوتی ہے، وہاں وہ شدت سے کام لیتا ہے اور جہاں اس کا پی جانا ضروری ہوتا ہے وہاں وہ حد اعتدال سے نہیں بڑھتا، اپنے نفس کا مالک ہوتا ہے، جانتا ہے کہ ایسے موقع پر۔ ع

ہر کرا علم نیست او چہ دوست

ظاہر ہے کہ ہم یہاں غضب کے استیصال کی تعلیم نہیں دے رہے ہیں، بلکہ اس کے اعتدال کی، ہم غضب میں افراط و تفریط کو بیخ کرکے وسط کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں کہ خیر الامور اوساطہا۔

دیکھو غصہ کا کوئی معروض ضرور ہوتا ہے، یعنی اس کا تعلق کسی شے سے ہوتا ہے، اب اس معروض کی تین شکلیں ہوتی ہیں[1]۔

(۱) ایک وہ جس کے لئے ضروری اور لازمی ہے، جیسے غذا، لباس، مکان صحت، جب ان پر حملہ کیا جاتا ہے تو شعلۂ غضب ان کے تحفظ کے لئے بھڑک اٹھتا ہے، حفاظت ذات و بقائے نسل کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہر جاندار اپنے دشمن کا مقابلہ کرے اور ضروریات زندگی کے تحفظ میں شدت و قوت کا استعمال کرے، ورنہ وہ صفحۂ ہستی ہی سے حرف غلط کی طرح مٹ جائے گا، اور یہ فطرت کا مقصود نہیں، مجاہدہ اور ریاضت سے اس قسم کے غصہ کو محو کرنا ممکن نہیں اور نہ ہی اس کی کوشش ہی کرنی چاہیے؛ کیوں کہ یہ خلاف

---

[1] مقابلہ سرِ احیاء العلوم باب غضب۔

فطرت ہے، اور غیر اختیاری، غیر اختیاری شئے پر حکم اخلاقی لگایا نہیں جا سکتا، ہاں یہاں بھی حدِ اعتدال سے تجاوز، ظلم و ستم ناروا ہے، اور بتکلف حلم و برداشت کرتے کرتے تحمل کی عادت پیدا کی جا سکتی ہے۔

(۲) غصہ کے معروض کی دوسری قسم میں وہ اشیاء داخل ہیں جو بعض کے لئے تو ضروری ہیں، اور بعض کے لئے غیر ضروری جیسے صنّاع کے لئے آلات و اوزار اور عالم کے لئے کتابیں، اگر ان محبوب اشیاء کو نقصان پہنچتا ہے تو رنج ہوتا ہے اور نقصان پہنچانے والے پر غصہ آتا ہے، اس قسم کے غصہ کا بھی بیخ و بن سے استیصال نہیں کیا جا سکتا، لیکن مجاہدہ سے غصہ کی شدت باطن میں باقی نہیں رہتی، اور صبر کی خو کی پیدا ہو سکتی ہے اور سختی صبر کا احساس کم ہو سکتا ہے۔

(۳) غصہ کے معروضات کی تیسری قسم میں وہ اشیاء شامل ہیں جو کسی کے لئے بھی ضروری نہیں، جیسے مال و جاہ، خدم و حشم، یہ عادتاً محبوب ہیں لیکن قطعاً داخل ضرورت نہیں، یعنی ضروریاتِ زندگی میں ان کا شمار نہیں کیا جا سکتا، یہ "نفسیات محض" میں شامل ہوتے ہیں، جو غیظ و غضب ان کے تعلق سے پیدا ہوتا ہے وہ ریاضت و مجاہدہ سے قطعاً قابلِ استیصال ہے ہم یہاں جو کچھ عرض کر رہے ہیں، اس کا زیادہ تر تعلق اسی قسم سے پیدا ہوتا ہے۔

جب ہم غصہ کی نفسیات پر غور کر کے یہ معلوم کر لیتے ہیں کہ اس کا انبعاث محبوب اشیاء کے فقدان یا ضیاع سے ہوتا ہے تو ہمیں ایک صداقتِ کلیہ کا صحیح وجدانی علم حاصل ہوتا ہے اور وہ یہ کہ غیظ و غضب کا اصل مبدء

"حب اشیاء" ہے، جس طرح تمام حزن و ملال کا مبدء بھی یہی حبّ اشیاء ہے نیز تمام حمق و جہالت کا بھی مبدء یہی ہے، رفع غضب کے لئے سچ پوچھو تو تبدیل مزاج کی ضرورت ہے، جیسا کہ عارف رومؒ نے فرمایا تھا کہ انما التدبیر بتدیل المزاج، اس کی تبدیلی کے لئے تنقیہ دماغ ضروری ہے جس کا انحصار تزکیۂ قلب پر ہے۔

اس کے لئے چند قرآنی اور نفسیاتی حقائق پر تجرید ذہنی کے ساتھ غور کرو، تم مال و دولت کو جو تمہارے قبضہ میں ہے اپنی ملک سمجھتے ہو کیونکہ تم اس پر متصرف ہو اپنی مرضی سے خرچ کرتے ہو، اپنی مرضی سے ذخیرہ کرتے ہو، اپنے مالک ہونے میں تمہیں کوئی شبہ نہیں ہوتا، ناگہاں تم بیمار ہوجاتے ہو، دولت تمہیں حالتِ صحت میں جان سے زیادہ عزیز تھی، لیکن جب درد کی شدت تمہیں بیقرار کرتی ہے تو مال تمہیں ماند نظر آنے لگتا ہے، تم اضطرار کے ساتھ طبیب کو طلب کرتے ہو، علاج و معالجہ پر بے دریغ خرچ کرتے ہو اسی چیز سے مفارقت گوارا کرتے ہو جو تم کو بہت زیادہ پیاری تھی! اب تمہیں معلوم ہوتا ہے کہ مال سے زیادہ محبوب شئے صحت ہے یعنی درد و الم سے رہائی اور سکون و آرام کا حصول، لیکن باوجود تمہاری تمام سعی و کوشش کے تمہیں صحتِ بدنی اور راحتِ قلبی حاصل نہیں ہوتی، تمہارے طبیب کا نسخہ اثر نہیں دکھلاتا، طبیب کے ابلہ ہونے کا تم کو یقین ہوجاتا ہے اور تمہیں خوف ہوتا ہے کہ یہ کہیں اجل کی پیش قدمی کی علامت نہ ہو، اس سے زیادہ قابل طبیب تمہارے علاج

میں مصروف ہوتے ہیں، تیر بہدف نسخوں کا استعمال ہوتا ہے، لیکن تمہارا درد بڑھتا جاتا ہے، اضطراب و اضطرار میں ترقی ہوتی ہے، تمہارا مال، تمہاری جاہ و حشمت تمہارے خادم و نوکر اپنے تمام ذرائع کا تم استعمال کر رہے ہو، لیکن ان سے تمہیں کوئی فائدہ کوئی نفع حاصل نہیں ہو رہا ہے تم اپنی تکلیف اپنے درد میں کسی قسم کی کمی نہیں پاتے اب تمہیں یاد پڑتا ہے کہ تم نے کہیں پڑھا تھا، یا کسی سے سنا تھا قُلْ لَّا اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا۔ الفاظ تمہارے ذہن میں تھے معنٰی کا تمہیں کھلا فہم حاصل نہ تھا، وجدان میں ان کا تحقق نہ ہوا تھا، ان کے مصداق سے بے خبر تھے اب شاید تمہیں پہلی مرتبہ روشنی نظر آ رہی ہے، جہل کی ظلمت دور ہو رہی ہے اپنی ہی ذات میں معنٰی کا تحقق ہو رہا ہے اور خود کو نہ نفع پہنچا پا رہے ہو اور نہ ضرر کے دفع کی قوت ہی کا تمہیں احساس ہو رہا ہے، پھر تم مالک کس شئے کے ہو؟ تمہاری مالکیت سے تمہیں کیا فائدہ؟ اپنی محبوب ترین جان سے تکلیف کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے؟ درد کی شدت میں رتی بھر کمی نہیں کر سکتے، ہاں تمہیں اس لیئے محبوب تھا کہ اس سے درد کا ازالہ ہوتا ہے، راحت حاصل ہوتی ہے، پھر یہ کیا ماجرا ہے، اس کا اثر کہاں گیا؟ جب مال کے اثرات تمہارے اختیار میں نہیں تو ایسے بے اثر مال کو لے کر کیا کروگے؟ یہ تو محض ایک بار گراں ہے، اس سے تو کر توشی ہے، یہ پھر اتنا عزیز اتنا محبوب کیوں ہو؟ سچ پوچھو تو یہ تمہاری ملک بھی نہیں، یہ حق تعالیٰ کی ملک کی ہے، لِلّٰهِ خَزَائِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (پ ۲۸ ع ۱۳) اور وہی اس کے حقیقی

مالک ہیں، لہٗ مَا فی السموات و ما فی الارض وما بینھما۔ یہ تمہارا مغالطہ تھا کہ تم اس کو اپنی ملک سمجھ رہے تھے اور اپنے کو اس کا مالک جان رہے تھے سچ پوچھو تو تمہاری کوئی چیز ہی نہیں، تم اپنی ذات کے لحاظ سے فقیر محض ہو، اور حق تعالیٰ ہی غنی و حمید ہیں، یایھا الناس انتم الفقراء الی اللہ و اللہ ھو الغنی الحمید (پ ۲۲ ع ۱۴) حق تعالیٰ نے اپنی عنایت اور رحمت سے تمہیں دولت دی، عزت دی، مال و دولت تمہارے پاس امانت ہیں، تم امین ہو، اس سے زیادہ نہیں، مالک و حاکم حق تعالیٰ ہیں، تمہیں حق امانت کا احساس ہونا چاہیئے، استرداد امانت کا جب وقت آئے تو تمہیں خوشی کے ساتھ اس کو مالکِ حقیقی کے سپرد کر دینا چاہیئے، جانتے ہو استرداد امانت کے مواقع کونسے ہیں؟ ان کی تفصیل کا یہ وقت نہیں لیکن اتنا یاد رکھو کہ جب تمہاری دولت پر آفت آتی ہے، وہ تمہارے ہاتھوں سے چھین لی جاتی ہے اور تم اس کو بچا نہیں سکتے، اور تمہارے قلب کے تار ٹوٹے جاتے ہیں، تمہیں احساس ہوتا ہے کہ تم اپنی ملک سے محروم ہو رہے ہو، تو تمہاری نارِ غضب بھڑک اٹھتی ہے، یہی وقت اس علم صحیح کے تحضر کا ہے کہ تم محض امین ہو مالک نہیں، مالک حقیقی استردادِ امانت چاہ رہا ہے، متاع غیر پر تمہارا اختیار نہیں، تمہارا فریضہ ہے کہ تشکر و امتنان کے جذبات کے ساتھ امانت کو حوالہ کر دو، غیظ و غضب کا کوئی موقع نہیں، بلکہ خوشی کا مقام ہے۔ دیانت دار امانت کے استرداد کے وقت ضیق محسوس نہیں کرتا، بلکہ اس کے قلب کو سرور و مسرت ہوتی ہے کہ اس نے اتنا عرصہ امانت کی حفاظت کی شرائط مقررہ کے

تحت اس پر متصرف رہا، اور بالآخر وقت مقررہ پر مالک حقیقی کے ہاتھ امانت سپرد کر رہا ہے۔

ہاں کیا تم جانتے ہو کہ تم پر ان بلیات کا نزول کیوں ہے؟ تمہارا مال تمہاری دولت، آفتوں کا نشانہ کیوں بن رہی ہے، اور تم غیظ و غضب کی آگ میں کیوں جل رہے ہو؟ کیا اس کا بڑا سبب یہی "خیانت فی الامانت" تو نہیں جہاں تم نے اپنے علم کی تصحیح کی، اپنے کو امین جانا اور امانت کے تصرف میں خیانت کو ترک کیا، اور شرائط معینہ کا خیال رکھا کہ فوراً تمہارے قلب کی حفاظت کر دی جاتی ہے اب وہ غصہ کی آگ سے محفوظ ہو جاتا ہے، اپنے فقرہ امانت کا علم ہو جانے کے بعد وہ اپنی حاکمیت کے وہم سے بھی نکل آتا ہے، حاکم حقیقی وہ حق تعالیٰ ہی کو جاننے لگتا ہے کہ ان الحکم الا اللہ کا اس کو یقین پیدا ہو جاتا ہے اپنے حکم کی خلاف ورزی پر اسکو آگ نہیں لگتی، اس کا شعلۂ غضب نہیں بھڑک اٹھتا، حب جاہ کا خاتمہ ہو جاتا ہے، اور نتیجہ کے طور پر جذبۂ غضب کا بھی استیصال ہو جاتا ہے، اگر مجھ پر وجدان میں یہ بات کھل جائے کہ میری ذات فقیر محض ہے مالک نہیں مملوک ہے، حاکم نہیں محکوم ہے، رب نہیں مربوب ہے، مولیٰ نہیں عبد ہے، ہاں اگر اس حقیقت کا محض نقلی علم نہیں، وجدانی تحقق ہو جائے تو اب میری نظر میں غضب کے سارے معروضات فنا ہو جاتے ہیں، مال و جاہ خدم و حشم کا تعلق میری ذات سے باقی نہیں رہتا، فقیر کو ان سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ یہ تو اس ذات کے لوازمات میں جو غنی و حمید ہے جو

مولیٰ و رب ہے، جو مالک و حاکم ہے۔

حق تعالیٰ ہی الٰہ ہیں، لا الٰہ الا اللہ، وہی معبود ہیں، اور مستعان اور ہم سب عبد، عبد اپنی ماہیت ہی کے لحاظ سے ذلیل ہے، اور فقیر، اس کی یہ نسبت ذل و افتقار حق تعالیٰ ہی سے ہے، کسی غیر سے نہیں، وہ غیر اللہ کی نسبت سے غنی ہے، اور حق تعالیٰ کی نسبت سے فقیر، غنی کا فقیر سارے عالم سے مستغنی ہوتا ہے، جب قلب مومن پر اس توحید کا غلبہ ہو جاتا ہے، تو وہ ساری دنیا سے اور دنیا کی تمام محبوب و مرغوب چیزوں کی محبت سے آزاد ہو جاتا ہے۔

رفت آنکہ بقبلۂ بتاں رو آرم　　حرف غم شاں بہ لوح دل بنگارم
آہنگ جمال جاودانی دارم　　حسنے کہ نہ جاوداں ازو بیزارم
(جامیؒ)

اور تم اوپر یہ دیکھ چکے ہو کہ غیظ و غضب کی اصل و منشا حبّ اشیاء فانیہ ہے، لا الٰہ الا اللہ سے قلب کا تزکیہ اور روح کا تجلیہ ہوا کہ حب اشیاء فنا ہوئی اور اس حُب کے فنا ہوتے ہی غضب کی بھی بیخ کنی ہو گئی!

(۴) **مجاہدہ:**۔ اس علم صحیح کے حصول کے بعد اب تمہیں مجاہدہ کی طرف توجہ کرنی چاہیئے۔ مجاہدہ علم کے قلب میں نفوذ سریان کے لیے ضروری ہے، مجاہدہ سے علم کا استقرار ہوتا ہے، تلوین جاتی ہے، تمکین پیدا ہوتی ہے مجاہدہ ہدایت کے راستوں کو کھولتا ہے، حصول مقصود کا یہی واحد ذریعہ ہے تمہارے سامنے جو علم صحیح اوپر پیش کیا گیا ہے، اس پر تدبر ضروری ہے تفکر لازمی ہے، فجر کا وقت اس کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہے

اس وقت اعصاب رات کی استراحت کی وجہ سے تازہ دم ہوتے ہیں، قلب کو سکون ہوتا ہے، دماغ افکار دنیوی سے نسبتاً خالی ہوتا ہے، ایسے وقت تمہیں زندگی کے کاروبار شروع کرنے سے پہلے اس ازلی و ابدی صداقت پر غور کرنا چاہیئے، اس کو قلب کی گہرائیوں میں اتارنے کی کوشش کرنی چاہیئے، اپنے تحت الشعور نفس تک پہنچانے کی سعی کرنی چاہیئے کہ مالک حاکم حق تعالیٰ ہیں، حکم ان ہی کا چلتا ہے، ہر چیز ان ہی کی ملک ہے، وہی رب ہیں اور وہی مولیٰ، ہم انہی کے مقہور ہیں، انہی کے در کے سائل ہیں، وہی ہمارے معبود ہیں، وہی مطلوب، وہی محبوب، وہی مقصود، ان کو دیکھ کر میں کسی چیز کا محتاج نہیں، میں غنی عن الشیٔ ہوں ہر شے سے نیاز، مجھ ہی سے ارشاد ہوا ہے:—

لکیلا تاسوا علی ما فاتکم	تاکہ جو چیز تم سے جاتی رہے تم اس
ولا تفرحوا بما اٰتاکم	پر رنج نہ کرو، اور جو چیز تم کو عطا فرمائی
(پ ۲۷ ع ۱۹)	ہے اس پر اتراؤ نہیں۔

کیوں کہ:—

عالم طفیل ماست موجود　　　مائیم ز کائنات مقصود

جوں جوں تمہارا مراقبہ، تمہارا تفکر و تدبّر عمیق ہوتا جائیگا، تمہارا نقطۂ نظر بدلتا جائے گا، اور یاد رکھو کہ نقطۂ نظر ہی کے بدلنے سے خودی میں انقلاب پیدا ہوتا ہے، اور خودی کے انقلاب سے کائنات کے چار سو بدل جاتے ہیں۔

تری خودی میں اگر انقلاب ہو پیدا عجب نہیں ہے کہ یہ چار سو بدل جائے

(اقبال رح)

اسی انقلاب مزاج سے تمہارے قلب سے اشیاء فانیہ کی محبت محو ہوتی ہے اور غصہ کا بیخ بھی مسمار ہو جاتا ہے جب تک تم نے اپنے کو مالک و حاکم جانا، امانت میں تم نے خیانت کی، امین نہیں غاصب ٹھہرے، غاصب کو یہاں کہاں امن وچین لینے دیتا ہے، تم میں اور کائنات میں توافق نہیں تخالف و تنازع قائم ہو گیا، اب ہر واقعہ تمہارے غضب کو بھڑکائے گا اور تمہارے لیے سوہان روح کا باعث ہو گا، جب تم نے اپنا نقطہ نظر بدلا، حق تعالیٰ کو مالک و حاکم جانا اور خود کو ان کا مملوک و محکوم، آداب امانت سے واقف ہو گئے تو اب کائنات میں اور تم میں توافق پیدا ہو جائے گا، اس توافق کے بعد انبعاث غضب کا کوئی موقع نہیں پیدا ہو سکتا۔

تسلیم نمی شوی از آں غم گیتی تسلیم شو ہر آنچہ آید بہ پیشت!

اس لیے نہیں دوران تفکر میں رضا بالقضاء کے اعتبارات پر خاص طور پر توجہ کرنی چاہیئے، دیکھو "مدبر امر" درحقیقت کون ہیں؟ حق تعالیٰ ہیں یدبر الامر من السماء الی الارض، جب وہ مدبر ہیں جب امر وحکم ان ہی کا چل رہا ہے تو ان کی تدبیر کے ساتھ حسن رضا درکار ہے نہ کہ غضب، غصہ دیکھو حق تعالیٰ کی ذات کامل، ان کے صفات کامل، ان کے افعال کامل، اور وہ ہی خالق (خلقکم وما تعملون) تو یہ بات تمہارے ذہن میں آجانی چاہیئے کہ ع

ہر چہ از دوست می رسد نیکوست

دیکھو حق تعالیٰ مومن پر رحیم ہیں کان بالمومنین رحیما۔ اب اگر تم میں ایمان ہے۔ اس کی حفاظت تم نے کرلی ہے تو اب ہر واقعہ تمہارے لئے نشان رحمت ہی پیش آئیگا اگر صورت قہر کیوں نظر نہ آئے کیونکہ حق تعالیٰ تم پر رحیم ہوکر تمہارا نقصان روا نہیں رکھتے، جب اس صداقت پر تم غور کروگے اور تمہارے قلب پر وہ مسلط ہوجائے گی تو بے اختیار تمہاری زبان سے یہ پرترنم الفاظ نکلنے لگیں گے

خواہی ز وصال شادمان دار مرا　　خواہی ز فراق بہ فغان دار مرا
من با تو نگویم کہ چسان دار مرا　　زانسان کہ دلت خواست چنان دار مرا

(اختتام)

یہ مجاہدہ کا انجام ہوگا، لیکن اس غایت کا حصول یک دم نہیں ہوتا، تمہیں اپنے کام میں لگے رہنا چاہیئے، اور ہمت و استقلال سے قدم بڑھائے جانا چاہیئے، کامیابی بالآخر مجاہد کے ہاتھ چڑھتی ہے اور کان حقا علینا نصر المومنین کا وعدہ اس لئے پورا ہوکر رہتا ہے۔

اندریں رہ می تراش و می خراش　　تادم آخر دمے فارغ مباش
دوست دارد دوست این آشفتگی　　کوشش بیہودہ بہ از خفتگی
کارکے کن تو و کاہل مباش　　اندک اندک خاک چہ را می تراش
چوں ز چاہے می کنی ہر روز خاک　　عاقبت اندر رسی در آب پاک
چوں نشینی بر سر کوئے کسے　　عاقبت بینی تو ہم روئے کسے

کامیاب زندگی کا قرآنی تصور[1]

تعبیرکن دانۂ خود را شجرے کن (صائب)

کامیاب زندگی! کتنا پاکیزہ، کتنا بلند نصب العین ہے، زندہ دلوں کا مقصود ہے، مطلوب ہے، محبوب ہے، اس کے چہرۂ زیبا سے ذرا نقاب تو اٹھا دو، دن کی پوری روشنی میں اس محبوب کے خط و خال نظر آئیں اور ہم چیخ اٹھیں سا

دستے کہ بپکر تو بدیں آب و تاب بجنت ... گرد رہت بر آئینہ آفتاب بیخت

(بیخود موہانی)

ورنہ بقول عرفی "خواب نادیدہ" کی تعبیر تو کچھ بے معنی چیز ہوگی۔

کامیابی کا لفظ اپنا آپ مفسر ہے۔ مقصود کا پانا کامیابی ہے، زندگی وہ کامیاب ہے جو اپنے مقصود سے ہم آغوش ہے، اب زندگی کا مقصود کیا ہے؟ بچوں کو سادہ زبان میں سمجھا کر اس سوال کا جواب پوچھو تو وہ کھیل کود، تماشا، لہو و لعب ہی کو مقصود زندگی قرار دیں گے، لیکن جب یہ بچپن کی منزل سے

---

[1] مطبوعہ معارف ۱۹۴۳ء

گذر کر جوانی کی دلفریب وادی میں قدم زن ہوتے ہیں، تو اب ان کا مقصود نئی صورت میں جلوہ افروز ہوتا ہے اب وہ زیب و زینت و آرائش و زیبائش اور تفاخر کو غایت حیات قرار دیتے ہیں اور اس سے حاصل ہونے والی لذت کو تمام "لذات" سے بالاتر! التباس کا یہ زمانہ بھی گریز پا ہوتا ہے، اور وہ بہت جلد زینت و تفاخر کو بچپن کی بے معنی خواہش سمجھنے لگتے ہیں جب ان کی عقلوں میں پختگی پیدا ہونے لگتی ہے تو پلٹ کر اپنی حالت پر نظر ڈالتے ہیں اور کہہ اٹھتے ہیں،

اے آنکہ تمام آرزو ہوسی طفلی مستی مخبطی خود چہ کسی!!

(رفیع واعظ)

اب زینت و آرائش سے زیادہ مقدس قیمتوں کی طرف ان کی نگاہیں اٹھنے لگتی ہیں وہ مال و دولت کے تکاثر، جاہ و سربلندی کے ترفع کو اپنی زندگی کا مقصود قرار دیتے ہیں اور بچپن اور نوجوانی کی خام آرزوؤں کو خبط اور مستی سے تعبیر کرتے ہیں، پختہ عقل کی پسند کی ہوئی یہ قیمتیں اب ان کا نصب العین ہوتی ہیں! انہی کے حصول میں وہ شب و روز سرگرم عمل رہتے ہیں، سمجھتے ہیں کہ بس ان کو پاکر وہ سارے عالم سے غنی ہو جائیں گے، طمانیت قلب ان کو میسر ہو گی، اور راحت جاں نصیب! اسی مغالطہ میں ان کی زندگی کے مختصر بہترین دن گزرتے جاتے ہیں، رنج و راحت کی مقدر مقدار انہیں ملتی ضرور ہے لیکن امل کی درازی اور عمر کی کمی بالآخر ان کی زبان سے کہلواتی ہے،

شد عمر تمام و ناتمامیم ہنوز! در دوزخ حسرتیم و خامیم ہنوز
عمریست کہ در راہِ طلب گام زنیم ویں طرفہ کہ در نخست گامیم ہنوز

(موہن یزدی)

پیری کی منزل میں قدم رکھ کر انسان کی بصیرت میں عموماً روشنی پیدا ہو جاتی ہے اب وہ زندگی کے مختلف تجربات سے واقف ہو جاتا ہے ان کے تمام التباسات کو جاننے لگتا ہے، اور نظر کا دھوکا جس کا ہر قدم پر جوانی میں وہ شکار ہو رہا تھا، اب اس سراب کو آب، خوب کو خراب عطر کو شراب کہنے اور سمجھنے پر مجبور نہیں کرتا، اب وہ اشیاء کے حقائق کا کسی قدر عارف ہو جاتا ہے، زندگی کے گونا گوں تجربات کا ذخیرہ تصورات کی شکل میں اس کے حافظہ میں محفوظ ہوتا ہے، ان ہی سے کام لے کر وہ زندگی کی ماہیت سے واقف ہو جاتا ہے، اس کا تخیل زندگی کو ہری بھری کھیتی کے مشابہ پاتا ہے، جس کی چندروزہ رونق و بہار نظر فریب ہوتی ہے، دلکش ہوتی ہے، ہوش ربا ہوتی ہے، فریب خوردہ عقل اس کو دائمی اور مستقل سمجھتی ہے، اس کی پرستش کرنے لگتی ہے اس کو اپنا مطلوب بنا لیتی ہے، اور اس کی گرویدہ ہو جاتی ہے، یکایک اس کھیتی کا رنگ بدلنے لگتا ہے یہ زرد پڑ جاتی ہے، آدمی اور جانور اس کو روند کر چورا کر دیتے ہیں،

کان لم تغن بالامس!

احوال جہاں و اصل ایں عمر کہ ہست خوابے و خیالے و فریبے و دمے است (خیام)

قرآن کریم نے اس حقیقت کو چند پاکیزہ جملوں میں یوں ادا کیا ہے،

اعلموا انما الحیوۃ الدنیا	تم خوب جان لو کہ دنیوی حیات محض
لعب و لھو و زینۃ وتفاخر	لہو ولعب اور زینت اور باہم
بینکم وتکاثر فی الاموال و	ایک دوسرے پر فخر کرنا اور
الاولاد کمثل غیث اعجب	اموال و اولاد میں ایک دوسرے
الکفار نباتہ ثم یھیج فتراہ	سے اپنے آپ کو زیادہ بتلانا ہے جیسے
مصفرا ثم یکون حطاما،	مینہ ہے کہ اس کی پیداوار کاشتکارکو
(پ ۲۷ ع ۱۹)	اچھی معلوم ہوتی ہے، پھر وہ
ترجمہ از مولانا اشرف علی تھانوی رح)	خشک ہو جاتی ہے تو اس کو

زرد دیکھتا ہے، پھر وہ چورا چورا ہو جاتی ہے)

بہتوں کے لئے زندگی کا مقصود یا تو لہو ولعب ہے، یا زینت و تفاخر، یا تکاثر اموال و اولاد، فلسفیانہ و اصطلاحی زبان میں اس کی تحلیل کرو تو معلوم ہوگا کہ اہل دنیا برترین اقدار یا تو لذت کو قرار دیتے ہیں، یا دولت کو یا شہرت کو اور دولت و شہرت سے بھی ایک قسم کی لذت و راحت ہی مطلوب ہوتی ہے اور ان کے نزدیک کامیاب زندگی سے مراد وہ زندگی ہے جو ان اقدار کے تحقق میں کامیاب ہوتی ہے ہمیں ذرا سنجیدگی سے یہاں زندگی کے ان اقدار یا غایات کا امتحان کرنا ہے، ؎

ہشدار کہ راہ خود بخود گم نہ کنی،

کیا لذت مقصودِ زندگی ہو سکتی ہے؟ کیا ہم لذت اندرونی اور دل کی

خوشی کے لئے پیدا ہوئے ہیں؟ کچھ مفکرین کا یہ خیال ضرور رہا ہے اسٹروڈورس کا خیال تھا کہ ہر اچھی چیز کا تعلق شکم سے ہوتا ہے[۱] اور فرائڈ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ساری کائنات کا محور و مرکز آلہ تناسل ہے۔ سائرینی مذہب کا بانی ارس تیوس لذت ہی کو مقصود حیات قرار دیتا ہے" اپنے پیروؤں کو اس کی تلقین تھی ؎

ہیچو منت اعتقاد باید کردن ... مے خوردن واندوہ جہاں ناخوردن

(خیّام)

اپیکورس خوش باشوں کا بادشاہ اپنی اخلاقیات کا اوّلین محرک جلب لذت اور دفع الم قرار دیتا ہے، لیکن اتنی بات مسلّم ہے کہ لذت کو خیر برتر قرار دینے سے اپیکورس کی مراد کسی عیّاش کی لذتوں سے تھی نہ شہوانی تعیّشات سے، بلکہ بدن کا درد و الم سے اور روح کا پریشانی و غم سے نجات دلانا اس کے پیش نظر تھا، فرصت کی زندگی ہو، آلام و افکار سے نجات ہو، دوستی و محبّت کا لطف ہو، فلسفے کا مطالعہ ہو، یہ تھے لذّت کے تضمنات، اپیکورس کے خیال میں خیّام کی زبان میں ان کو اس طرح ادا کیا جا سکتا ہے ؎

تنکے مے لعل خواہم و دیوانے ... سدّ رمقے باید و لقمہ نانے

---

[۱] اور انسان کی حالت مکھی سے بہتر نہیں جو ہمیشہ حلوے ہی کی شیفتہ ہوتی ہے۔

ہر جا کہ مگس بود چہ بالا چہ پست ... جز شیفتہ در لوزی حلوا نیست

(سحابی استرآبادی)

دانگہ من و تو نشستہ بہ ویرانے   خوشتر بود از مملکت سلطانے

خود خیام نے جہانِ بیوفا کا حاصل لذت کے سوا کچھ نہ پایا ۔ صاحب نظر جب عالم پر غور کرتا ہے، ہر شے کا جائزہ لیتا ہے تو اس کو خیام کی رائے میں اقرار کرنا پڑتا ہے کہ ؎

در عالم خاک از کراں تا بہ کراں   چندانکہ نظر کنند صاحب نظران

حاصل ز جہاں بیوفا چیزے نیست   الا مئے لعل و عارض خوش پسران

ایک روز مرنا ضرور ہے "بے مونس و بے حریف و بے ہمدم و جفت" قبر کے گوشے میں سونا ضرور ہے، اور یہ بھی صحیح ہے گو ایک راز نہفتہ ہے کہ ؏

ہر لالۂ پژمردہ نخواہد بشگفت !

تو پھر طلب لذت و دفع الم کے سوا زندگی کا مقصود ہو کیا سکتا ہے؟ لذتیت کے اسی بنیادی اصول کو خیام قوت کے ساتھ پیش کرتا ہے ؎

کم خور غم روزگار ناساز شدہ   میخور ز کف ساقی دمساز شدہ

کاں کز کس مادر آمد (دفع الم) امروز بروں   فردا بینی بکون زن باز شدہ

کسی راستہ چلنے والے عامی کو روک کر پوچھو کہ وہ دنیا سے کیا چاہتا ہے؟ الفاظ کوئی استعمال کرے اس کا مدلول و مفہوم ہوگا وہی جو طلب لذت، دفع الم سے تم سمجھتے ہو! وہ درد و غم سے نجات چاہتا ہے اور لذت و خوشی کا طلب گار ہے اشیاء کا اچھا یا بُرا ہونا اس کے نزدیک لذت بخش یا الم رساں ہوتا ہے، وہ الم رساں و تکلیف دہ شے کو بری سمجھتا ہے اور لذت بخش اور فائدہ رساں چیز کو اچھی! اس کی خواہش کا انتہائی مطلوب کسی نہ کسی

صورت میں لذت ہی ہوتی ہے! یہ ہے "نفسیاتی لذتیت" کے حامیوں کی تحقیق اور ادّعا، اس نفسیاتی تحقیق سے قطع نظر کرکے کہ انسان ہمیشہ لذت ہی ڈھونڈتا ہے، لذت ہی پر جان دیتا ہے، لذت ہی کو اپنا محبوب قرار دیتا ہے، یہ دعویٰ کہ انسان کو لذت ہی ڈھونڈنی چاہیئے، لذت ہی کو اپنا مقصودِ حیات قرار دینا چاہیئے، "اخلاقیاتی لذتیت" کے قائل پیش کرتے ہیں۔

ذرا غور تو کرو کہ کیا یہ بات صحیح ہے کہ انسان صرف لذت ہی کی خواہش کرتا ہے لذت ہی کی تلاش میں اس کے روز و شب بسر ہوتے ہیں؟ یا اسکو صرف لذت ہی کی تلاش کرنی چاہیئے، لذت ہی کو اپنی غایت قصویٰ قرار دینی چاہیئے؟ کیا یہ صحیح ہے کہ

جہاں از پئے شادیٔ و دل خوشی است　　نہ از بہر بیداد و محنت کشی است؟

یا سچی بات دراصل یہ ہے کہ

نہ ایم آمدہ از پئے دل خوشی　　مگر کز پئے رنج و محنت کشی!

فتفکروا ولا تکونوا من المستعجلین!

لذتیت کی نفسیاتی شکل کا بطلان تو تم پر تھوڑے سے نفسیاتی غور و فکر سے خود ظاہر ہو جائے گا، دیکھو بات یہ ہے کہ ہماری خواہشات کا مبدء، در اصل ہماری احتیاجات ہیں، اشتہاآت ہیں، ہماری خالص انسانی اغراض ہیں، جب ان احتیاجات وغیرہ کی تشفی ہوتی ہے تو لذت نتیجہ کے طور پہ پیدا ہوتی ہے، البذا کم از کم بعض مثالوں میں تم کو یہ ماننا ہی پڑے گا کہ ہماری خواہشات کا مطلوب اصل میں وہ اشیاء ہیں جن سے ان خواہشات کی تکمیل ہوتی ہے

نہ کہ مجرّد لذت، دیکھو ہمیں پہلے بھوک لگتی ہے، اور پھر کھانے کی لذت حاصل ہوتی ہے یعنی اوّل احتیاج، پھر اس کی تشفی اور نتیجہ کے طور پر لذت، یہی بات تمام لذتوں کے متعلق صحیح ہے، لذت ہماری احتیاجات کی تشفی کے نتیجہ کے طور پر پیدا ہوتی ہے اور احتیاجات کا وجود تشفی سے مقدم ہوتا ہے، اس میں شک نہیں کہ جب اس طرح ہم لذت کی چاشنی سے واقف ہو جاتے ہیں تو بعض دفعہ لذت ہی کی لذت ہی کی خاطر خواہش کرنے لگتے ہیں، مثلاً بھوک کی تشفی سے جو لذت حاصل ہوتی ہے، اس کو جان لینے کے بعد ممکن ہے کہ بغیر بھوک کے لذت ہی کی خاطر نگلنے لگیں اور اس طرح دانتوں سے اپنی قبر اپنے ہی پیٹ کے اندر کھودنے لگیں، اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ سر حالت میں ہماری خواہشات کا مطلوب لذت نہیں ہوتا، احتیاج کی تشفی، درد کی دوا اشتہا کی تسکین ہر فرد چاہتا ہے اور اس کے نتیجہ کے طور پر اس کو لذّت و فرحت محسوس ہوتی ہے، تو لذت بریڈلے کے الفاظ میں نام ہے تحقق ذات یا تکمیل نفس کے احساس کا کیونکہ فطری احتیاجات و اشتہاآت کی تشفی ہی سے ہماری ذات کی بڑی حد تک تکمیل ہوتی ہے، ان احتیاجات میں بدن و ذہن یا روح دونوں کی ضروریات شامل ہیں، انہی ضروریات کی تکمیل سے لذت پیدا ہوتی ہے لہذا خواہش براہ راست لذت سے متعلق نہیں ہوتی، لذّت براہ راست معروض خواہش نہیں، اور نہ بذاتہ خود ہمارے لئے قیمت رکھتی ہے، ہاں اس کو "مقیاس قیمت" قرار دیا جاسکتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ تھرما میٹر کا درجۂ حرارت خود حرارت نہیں ہوتا بلکہ مقیاس الحرارت

ہوتا ہے، لذّت ہر جسمانی و روحانی اقتضا کی تکمیل کے بعد لاحقہ کے طور پر نمودار ہوتی ہے لیکن خود کبھی مقصود بالذات نہیں ہوتی، اس لیئے لذتیۃ کا یہ کہنا کہ انسان صرف لذت ہی کی خواہش کرتا ہے نفسیات کی رو سے صحیح نہیں معلوم ہوتا

اگر ہماری یہ سیدھی سادھی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آرہی ہے تو خود تجزّیہ کرکے دیکھو، لذّت کو مقصود بالذات قرار دو اور اس کے حصول کی کوشش کرو، بہت جلد تم کو معلوم ہونے لگے گا کہ اس طرح لذّت کا پانا اپنے سایہ کے پکڑنے سے زیادہ دشوار ہے، یہ عجیب بات ہے اور ہر تجربہ کار لذّت پرست کو شاید اس کا اقرار ہے۔ فلاسفہ اس کو "استبعاد لذّتیت" کے نام سے موسوم کرتے ہیں، کہ لذّت کی جتنی تلاش کرو اتنی ہی وہ بچ نکلتی ہے، جتنی زیادہ اس کی خواہش کرو، اتنی ہی کم وہ ملتی ہے، اور جس قدر بے پروا اس کی طرف سے ہو جاؤ، اسی قدر وہ تمہارے پیچھے دوڑتی ہے، پروفیسر ڈیوے کے یہ الفاظ حکیمانہ صداقت کے حامل ہیں۔

جب جذبہ کا رجحان باطن کی طرف ہوتا ہے تو وہ اپنی فنا کا آپ باعث ہوتا ہے، اور اس کے نتیجہ کے طور پر انسان یا تو کلبیت اختیار کر لیتا ہے، اور سرد دقی میں مبتلا ہو جاتا ہے، یا پھر ہر لحظہ نئی چیز کی تلاش میں رہتا ہے، جدید ترین احساس کا خواہشمند ہوتا ہے، جو اس کی لیت اور درماندہ جذباتی فطرت کو اکسائے اور اس میں نئے سرے سے جان ڈالے، اگر کوئی شخص محض حسی زندگی بسر کرے، اپنے وجود کے قوانین کو توڑتا ہے اور ان اشیاء سے بے نیاز ہونا چاہتا ہے جن کے ساتھ یہ احساسات طبعًا پائے جاتے ہیں تو اس کی

قوتِ احساس رفتہ رفتہ مضمحل ہو جاتی ہے، اور وہ اپنے مقصد کی شکست کا آپ
باعث ہوتا ہے، وہ جذباتی خودکشی کا مرتکب ہوتا ہے[1]

اسی صداقت کا علم ہونے کے بعد سیرینیہ اور اتباع اپیکورس نے یہ مان لیا کہ ایجابی لذّت کا حصول انسان کے لئے ناممکن ہے، ان کی لذتیت میں قنوطیت کی جھلک پیدا ہو گئی، اب وہ بجائے حصولِ لذّت کے دفعِ الم کو مقصدِ حیات قرار دینے لگے، اپیکورس کا یہ قول مشہور ہے،

جو چیزیں زندگی کو مسرور بناتی ہیں، وہ نہ پیہم شربِ مدام ہے اور نہ صنفِ نازک کی صحبت اور نہ مرغ و ماہی اور قیمتی ماکولات سے آراستہ کئے ہوئے دسترخوان، بلکہ سنجیدہ و متین غور و فکر جو ہر عمل انتخاب و اجتناب کے اسباب و وجود کا امتحان کرتا ہے، اور ان بیہودہ خیالات و اوہام کو دور کرتا ہے جو روح کی پریشانی اور اختلال کا باعث ہوتے ہیں۔[2]

سچ ہے:-

اصلاحِ مزاج از ضروریات است   یک تنقیۂ دماغ می باید کرد!

(واقف)

ارس تی پوس کا مشہور پیرو ہیگے سی سیس (HEGASIUS) لذت کو

---

[1] نفسیات ص ۲۹۹۔

[2] دیکھو بیک ول کی کتاب THE SOURCE BOOK OF ANCIENT PHILOSOPHY ص ۳۰۰ بمقابلہ کردہ راقم کی کتاب فلسفہ یاس ص ۶۸۹۔

مقصود حیات قرار دیتا ہے، اور اس کی طلب میں کوشاں ہوتا ہے، بہت جلد تجربہ اس کو سکھلاتا ہے کہ باغ جہاں میں غم ہی کا تو میوہ ہر شخص کو نصیب ہوتا ہے، اور اگر کوئی بے غم ہے تو وہ بنی آدم نہیں، طرفہ جانور ہے!

عالم ہمہ داد ست و دوا می خواہد   از خوانِ کرم برگ و نوا مے خواہد
کس بے حاجت نمی تواند دیدن   درویش غذا، شہ اشتہا می خواہد

(سحابی استرآبادی)

جب لذّت مقصود حیات اور وہ ناقابل حصول تو پھر زندگی کی کوئی قیمت نہیں ہوسکتی، دنیا استخوان بے مغز ہے، عاقل اس استخواں کو کتّوں کے آگے پھینک دیتا ہے، موت کو زندگی پر ترجیح دیتا ہے، موت ہی میں راحت جان پاتا ہے، موت ہی سے سارے درد و الم رفع ہو جاتے ہیں، اور غم وہم دور! ایجابی لذّت ناقابل حصول، لیکن سلبی لذّت ممکن اور وہ موت کے ذریعہ لہذا،

با چرخ ستیزہ کار ستیزہ برو   باگردش دہر در ستیا ہیزہ برو!
یک کاسۂ زہر است کہ مرگش خوانند   خوش درکش و جرعہ درجہاں ریزہ برو!

(امیر ابو اسحق)

یہ تھا استدلال ہیگیسی سی لیس کا، اور اس قوت و اثر کے ساتھ یہ پیش کیا گیا، کہ لوگوں نے خودکشی شروع کر دی اور اس کو "داعی الی الموت" کا خطاب دیا! جو لوگ زندگی کا مقصد وحید لذت اندوزی اور ذوقیت کو قرار دیتے ہیں، انہیں اسی طرح استدلال کرنا پڑے گا۔

لذتیت سے قنوطیت کا ایک ہی قدم کا فاصلہ ہے، جب لذت پرستوں کا تجربہ یہ ہے تو بتاؤ کہ ع

با توبہ مستورۂ لذت چہ کند کس؟

اخلاقیاتی لذتیت کے حامیوں کا یہ دعویٰ کہ لذت ہی کو زندگی کی غایت قصوی قرار دینا چاہیئے، دیوانگی نہیں تو کیا ہے؟

نہیں، لذت زندگی کی غایت نہیں، عقلمند لذت کی ماہیت و مقام سے واقف ہوتا ہے، طیبات حیات کو حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا، لیکن وہ زندگی کا مقصود لذت اندوزی نہیں قرار دیتا، مجرد لذت کا کبھی تعاقب نہیں کرتا، اس کو موج سراب اور جوش حباب سمجھتا ہے، اور اس کے دھوکے میں نہیں آتا ع

ان اللبیب بمثلہا لا یخدع

وہ اپنے مقصود کے حصول میں سرگرم عمل ہوتا ہے اور مسرت خود سنا کی طرح اس کا پیچھا کرتی ہے، مقصود کے حصول میں اس کا ہر عمل لطف انگیز، ہر حرکت فرحت بخش ہوتی ہے، جانتے ہو کہ یہ مقصود کیا ہے؟ رضائے حق! حق تعالیٰ ہی سے اس کو آرام جاں اور برد قلبی نصیب ہوتی ہے اور عارف رومؔ کے ساتھ مل کر وہ لذتیہ سے کہتا ہے ؎

گر گریزی بر امید راحتے   ہم ازاں جا پیشت آید آفتے
ہیچ کنجے بے دد و بے دام نیست   جز بخلوت گاہ حق آرام نیست

جب لذت مقصود زندگی نہیں تو کیا شہرت یا اشتہار خلق جاہ و مرتبت

نام و نمود وہ اعلیٰ اقدار ہیں جن کا حصول زندگی کی غایت قرار دیا جاسکتا ہے؟

ہم میں سے بہت سارے ایسے ہیں جنہیں زبان کی لذت سے کان کی لذت زیادہ مرغوب معلوم ہوتی ہے، وہ اس لطف کے لئے اپنی تمام کثیف لذتوں کو قربان کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں، مصائب میں گرفتار ہونے سے نہیں گھبراتے، درد و غم برداشت کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں، آفتوں اور خطروں کا مقابلہ کرتے ہیں، جب ان سے کہا جاتا ہے کہ شہرت کی قیمت بلا و مصیبت ہے تو بھی ان کی ہمت پست نہیں ہوتی، ان کے لئے شہرت غایت الغایات ہے، خیر برترین ہے، مطلق قیمت ہے، اضافی قیمت نہیں!

شہرت کی خواہش ہر انسان میں کسی قدر ضرور موجود ہوتی ہے، اس کا راز یہ ہے کہ انسان کا نفس تنقیص کو فطرۃً ناپسند کرتا ہے، اور علو و بلندی کو طبعًا پسند! بندہ ہونا اس کے نفس پر شاق ہوتا ہے، ربوبیت طبعًا محبوب ہے، ہر شخص کے باطن میں وہ جذبہ موجود ہے، جس کی تصریح فرعون نے اپنے اس قول سے کی تھی انا ربکم الاعلیٰ، اس کی رفعت کا جب لوگ اقرار کرتے ہیں، تو وہ خوش ہوتا ہے، بقول عارف رومؒ فربہ ہوتا ہے:-

جانور فربہ شود از راہ نوش
آدمی فربہ شود از راہ گوش

شہرت کا طالب دراصل لذت ہی کا پجاری ہے، اس کا معبود بھی ایک قسم کی لذت ہی ہے، وہ اپنے نفس کی کبریائی کا اعلان چاہتا ہے، تشہیر چاہتا ہے اور اس کو حاصل کرنے کے لئے ہر قیمت کو ادا کرنے پر تیار ہوتا ہے

اب غور کرو وہ اپنی مسرت، اپنی بردقلبی کی عمارت کس بنیاد پر قائم
کر رہا ہے، ہوا پر، تعریف جو خلق کی زبان سے نکل رہی ہے، وہ آخر ہوا ہی
تو ہے، جس کا خفیف سا جھونکا بھی ہمارے بیمار شہرت کے دل کے غنچہ کو
شگفتہ کر دیتا ہے، مگر کیا کوئی عقلمند اپنی مسرت کے قلعہ کو اس قدر کمزور
بنیادوں پر قائم کرے گا؟ کیا ہوا پر اس کا اختیار ہے؟ کون جانتا ہے کہ
آج ہوا کا رخ کس طرف ہوگا؟ عوام کالانعام آج اپنے ہیرو کو اوج
آسمان پر جگہ دیتے ہیں، اور کل بغیر کسی وجہ کے خاک مذلت پر پٹک دیتے
ہیں، آج تحسین و تصفیق ہے، اور کل زجر و توبیخ، اور کچھ دن بعد مطلق ذہول
اور فراموشی یہ ہے المناک تجربہ تقریباً ان تمام پرستاران شہرت کا جنہیں
عوام نے کچھ دن کے لئے بت بنا کر پوجا تھا، ولنگٹن واٹرلو کا فاتح اعظم
نپولین کو شکست دیتا ہے، اپنے زمانہ کی تہذیب و تمدن کو غارت و برباد
ہونے سے بچا لیتا ہے، عوام اس کو سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں، رجل اعظم کا
خطاب دیتے ہیں اور کچھ ہی دن بعد لندن کی گلیوں میں یہی مشتعل و غضب
آلود مجمع پتھروں سے اس کے خود کو توڑ پھوڑ ڈالتا ہے، جس کو ولنگٹن اپنی
موت کے دن تک محفوظ رکھتا ہے جولیس سیزر ایک دن دنیا پر حکومت
کرتا ہے اور دوسرے دن احسان فراموش دوستوں کے ہاتھ موت کے
گھاٹ اتار دیا جاتا ہے، سکندر اعظم کی لاش تین دن تک بے گور و کفن پڑی
رہتی ہے اس کو عزت کے ساتھ خاک کے سپرد کرنے کو بھی کوئی نہیں ملتا،
یہ ہے انجام ہر شہرت و رفعت کا!

گیرم پسرا کہ رستم و سام شدی ‏ یا خسروئی نیمروز یا شام شدی
نہ زور بگور می تواں بردنہ زر ‏ افسوس کہ کیمیائے او ہام شدی

(نصرت اللہ خاں نثار)

شہرت کا اثر سیرت پر کیا ہوتا ہے؟ شہرت سے عجب و پندار پیدا ہوتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان اپنی ہی ذات کو کبیر اور سارے عالم کو اپنے مقابلہ میں حقیر سمجھتا ہے یا مقیدؔ ہو کر مطلق ہونے کا دعویٰ کرتا ہے' بندہ ہو کر خدا بنتا ہے، جب اس کو خدا سے ڈرایا جاتا ہے تو اپنے تکبرؔ اور عزت کے گھمنڈ میں حدود اللہ سے تجاوز کرتا ہے وَاِذَا قِیْلَ لَہُ اتَّقِ اللہَ اَخَذَتْہُ الْعِزَّۃُ بِالْاِثْمِ (پ ۲ ع ۹) جس شخص کا دماغ اس قدر الٹ جائے اس کو مسرت و طمانیتؔ قلبی کہاں نصیب ہو سکتی ہے؟ اسکو ہر قدم پر خلاف طبیعت عناصر سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے، کوئی اس پر طعن کرتا ہے اور کوئی حسد، کوئی اس کو "قطرۂ آب گندہ" کہتا ہے، اور کوئی "طرفہ جانور" اس کا ہر عیب دنیا کے سامنے نمایاں طور پر پیش کیا جاتا ہے اس کی کوئی غلطی لوگوں کی نگاہوں سے بچ نہیں سکتی، شہرت کی وجہ سے گویا وہ آفتاب کے نیچے کھڑا ہوتا ہے، اور اس کا ہر نقص اب نمایاں ہے اور بقول عارف روم اس کی حالت یہ ہوتی ہے'

خشمہا و چشمہا و اشکہا!
بر سرش ریزد چو آب از مشکہا!

ایک آرزوئے شہرت، تمنائے رفعت، خواہش علو اس کو ہر اوّل

غموں اور آفتوں میں مبتلا کرتی ہے، اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ حق سے کٹ کر خلق سے اپنا رشتہ جوڑتا ہے اور خلق سے سوائے غم و اندوہ کے اور کیا ہاتھ آسکتا ہے، وہ خلق کے قلوب کو ہمیشہ مسخر رکھنا چاہتا ہے ان پر اعتماد کرتا ہے، سمندر کی موجوں پر گھر بنا رہا ہے اور سمجھتا ہے کہ اساس پائدار اور مستقل ہے۔ فیا للعجب! خلق کے وعدوں سے وہ خوش ہوتا ہے، لیکن اس کی خوشی کی مدت ایک رات سے زیادہ نہیں،

وعدۂ ارباب دنیا سمجھ خواب احتلام!
شب بہ شب عیش و عشرت باشد فردا دمرغ
(کلیم)

ایسے احمق پر ترس آتا ہے اگر اس کے مقصود حیات کو کوئی عاقل اپنی زندگی کا مقصود بنانا پسند نہیں کرتا،

نہیں! ہم محض حصول جاہ کو زندگی کی غایت نہیں قرار دے سکتے اس میں گو کسی قدر لذت ضرور ہے، لیکن یہ غیر مخلوط لذت نہیں، درد و امنت، رنج و مصیبت کا عنصر اس مرکب میں بہت زیادہ ہے، یہ انسان میں کبر و غرور پیدا کرتا ہے، اور متکبر نہ دنیا میں راحت و طمانیت پا سکتا ہے اور نہ آخرت میں فوز و کامیابی، وہ دل کا اندھا ہوتا ہے، حق تعالیٰ کی نشانیوں کی پہچان سے محروم رہتا ہے، حق بات اس کو نظر نہیں آتی، حق کی طرف سے اس کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں، جب دید حق نہ رہے تو پھر اس میں پست سے سوا رہ کیا جاتا ہے؟

آدمی دید است و باقی پوست است — دید آں باشد کہ دید دوست است

(رومی)

ساصرف عن آیاتی الذین یتکبرون	میں ایسے لوگوں کو اپنی نشانیوں سے برگشتہ
فی الارض بغیر الحق (پ ۹ ع ۶)	ہی رکھوں گا جو دنیا میں تکبر کرتے ہیں
	جس کا ان کو کوئی حق نہیں۔

اسی کی طرف اشارہ ہے، اور اسی وجہ سے وہ حق تعالیٰ کا مبغوض ہو جاتا ہے انہ لا یحب المستکبرین ! جب وہ حق کھو چکا، حق تعالیٰ کا مبغوض قرار پا چکا، تو پھر اس کے ہلاک ہونے میں باقی کیا رہا، انانیت، اپنی ذات سے محبت، اپنے ہی ذکر کے انتشار کی خواہش، اپنی ہی تعریف کی محبت اور اس سے پیدا ہونے والی لذت، یہی تو ہیں، اجزاء اس کی ہلاکت اور بربادی کے ! اسی لئے نفس انسانی کے امراض سے پوری طرح واقفیت رکھنے والے حکیم نے فرمایا تھا کہ

انما ھلاک الناس	ہوا و ہوس کی پیروی اور اپنی
باتباع الھویٰ وحب	تعریف و توصیف کی محبت لوگوں کی
الثناء۔	ہلاکت کا باعث ہوتی ہے۔

ایک اور طریقہ سے اسی صداقت کا اظہار شدت کے ساتھ فرمایا گیا ہے۔

ذئبان ضاریان ارسلا	دو بھیڑیئے حملہ کرنے والے جو بھیڑوں
فی زریبۃ غنم لیس باکثر	کے گلے میں چھوڑ دیئے جائیں، اتنا
فسادا من حب الشرف	نقصان نہیں کرتے جتنا کہ شرف اور

والمال فی دین الرجل — مال کی محبت مسلمان آدمی کے دین

(مسلم) — میں کرتی ہے۔

اسی "حب الشرف" سے ارادۂ رفعت یا ارادۂ علو پیدا ہوتا ہے اور جب تک انسان اس سے خالی نہیں ہوتا، اپنی آخرت درست نہیں کر سکتا۔

تلك الدار الآخرة نجعلها — یہ عالم آخرت ہم ان ہی لوگوں

للذین لا یریدون علواً — کے لئے خاص کرتے ہیں، جو دنیا میں

فی الارض و لا فساداً — نہ بڑا بننا چاہتے ہیں اور نہ فساد

والعاقبة للمتقین۔ — کرنا اور نیک نتیجہ متقی لوگوں کو

(پ ۲۰ ع ۱۲) — ملتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ حضرت خلیفہ عمر بن عبدالعزیز اس آیت کو مرتے وقت پڑھتے تھے، یہاں تک کہ پڑھتے پڑھتے جان دی۔

خوب سمجھ لو کہ ہم حصولِ کمال سے نہیں منع کر رہے ہیں، ہم علم میں منفرد یا کمال ہونے کی آرزو کو جائز سمجھتے ہیں، ہم کمالِ حریت یعنی شہوات و جذبات سے آزادی، دنیوی تردّدات سے نجات کو حقیقی کمال قرار دیتے ہیں، ہم حق تعالیٰ اور ان کے صفات و افعال مالکیت و حاکمیت کے علم کو سب سے زیادہ اعلیٰ و حقیقی کمال سمجھتے ہیں، اور ہمارے عقیدہ کی رو سے یہ علم یہ معرفت عارفین کے لیے مرنے کے بعد نور بنے گی[1]

---

[1] دیکھو مذاق العارفین ترجمہ احیاء العلوم جلد سوم ص ۱۹۰ و ۲۰۰

نورھم یسعیٰ بین ایدیھم	ان کا نور ان کے داہنے اور ان کے
وبایمانھم یقولون ربنا	سامنے دوڑتا ہوگا، یوں دُعا کرتے
اتمم لنا نورنا۔	ہوں گے کہ اے ہمارے پروردگار
(پ ۲۸ ع ۲۰)	ہمارے لیئے اس نور کو آخر تک رکھ۔

اور جو اس نورِ معرفت سے بے بہرہ ہوں گے ان کا حال اس شخص کا سا ہوگا، جو اندھیریوں میں پڑا ہے۔

کمن مثلہ فی الظلمات	اس شخص کی طرح جس کی حالت یہ
لیس بخارج منھا	ہو کہ وہ تاریکیوں میں ہے ان سے
(پ ۸ ع ۲)	نکلنے ہی نہیں پاتا۔

ہم اس جذبہ کی مذمّت کر رہے ہیں، جس کی وجہ سے کمال کے پیدا ہونے کے بعد ایک شخص اپنی ذات کو کبیر اور سارے جہان کو حقیر و صغیر سمجھتا ہے، یا پھر کمال اس لیئے حاصل کرنا چاہتا ہے کہ لوگوں کے دلوں اور جسموں پر حکومت کرے، اور اس سے حاصل ہونے والی لذت و خوشی کو اپنی زندگی کا مقصود قرار دے۔ اس خصوص میں حضورِ انور صلّی اللہ علیہ وسلم نے ایک دعا کی صورت میں سیدھے راستے کی تعلیم فرمادی تھی۔

اللھم اجعلنی صبوراً وشکوراً	حق تعالےٰ مجھے صابر و شاکر بنا، مجھے اپنی
واجعلنی فی عینی صغیراً وفی	آنکھوں میں صغیر رکھ اور لوگوں کی آنکھوں
اعین الناس کبیراً[1]	میں کبیر بنا۔

---

[1] یہ دعا حضرت بریدہ رضا کی روایت سے مسند بزار میں ملتی ہے۔

جب میں خود اپنی آنکھوں میں حقیر رہوں، اپنی بندگی و بے چارگی کو بھول نہ جاؤں، اپنی ظلمت وجہل سے باخبر رہوں، تو پھر مجھ میں نہ اپنی تعریف کی خواہش پیدا ہوتی ہے، اور نہ کبر کا مذموم جذبہ۔ اب حق تعالے اپنے اس متواضع بندہ کو رفعت عطا فرماتے ہیں، اور حقیقی کمال سے حصۂ وافر! یہ بزرگی اور کمال کا عطیہ ہے اور اس کا استعمال معطی کے احکام کے مطابق ہی کیا جا سکتا ہے۔

مقصود حیات اگر شہرت یا اشتہار خلق نہیں تو کیا مال و دولت کو زندگی کی انتہائی غایت قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس امر میں شاید کسی کو ہم سے اختلاف نہیں ہوگا کہ مال ہمیشہ ایک ذریعہ ہے کسی غایت کے حصول کا، خود غایت نہیں، ہم نے ان غایات میں سے بعض پر اوپر بحث کی ہے، اور ان کو زندگی کا مقصود نہیں قرار دیا، یعنی اگر مال سے جاہ طلبی یا لذت اندوزی مقصود ہو تو پھر مقصود کے ابطال سے ذریعہ کا باطل ہونا بھی لازم آئے اور اگر جائز مقصد حیات کے حصول میں یہ استعمال ہو تو پھر یہ ایک زبردست قوت ہے اور عظیم الشان نعمت سہ

مال را گر بہر دیں باشی حمول
نعم مالٌ صالحٌ گفتش رسول ؐ

اب ہمیں زندگی کے حقیقی مقصد کے تعین کی طرف توجہ کرنی چاہیئے۔
قرآن کریم کی ہدایت کی روشنی میں مقصود حیات کا تعین ضروری ہے۔

حق تعالیٰ کی معرفت اور ان کی عبادت جہاں کی تخلیق کی غایت ہے
صریح ارشاد ہے :۔

وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون[1]۔

عبادت بغیر عرفانِ حق کے ممکن نہیں، لہذا وحدت ذاتیہ حق کی معرفت اور اس کی عبادت کے سوا جہاں کا کوئی مقصود نہیں، ہر نبی اور ہر رسول کے پیغام کا خلاصہ بس یہی تھا،

یا قوم اعبدوا اللہ ما لکم	اے میری قوم تم اللہ کی عبادت
من الہ غیرہ (پ ۱۲ ع ۵)	کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود ورب نہیں ۔

جامیؔ نے اس مقصود کو ان دل پذیر اشعار میں ادا کیا ہے ؎

از زندگیم بندگی تست ہوس | بر زندہ دلان بے تو حرام ست نفس
خواہد ز تو مقصود دل خود ہر کس | جامی ز تو ہمیں ترا می خواہد و بس

زندگی کا مقصود برترین مقصود، غایت الغایات حق تعالیٰ ہیں، ان کی بندگی ہے، ان کی عبادت وبندگی ہے، ان کا عشق و محبت ہے یا یوں کہو کہ ہماری ساری عبادت ہمارا جینا اور ہمارا مرنا سب خالص حق تعالیٰ ہی کے لئے ہے ۔

قل ان صلاتی ونسکی | کہو کہ بالیقین میری نماز اور

---

[1] حضرت ابن عباس رض نے لیعبدون کی تفسیر لیعرفون سے کی ہے۔

ومحیای ومماتی للہ رب	میری ساری عبادت، اور میرا جینا اور
العالمین لا شریک لہ و	میرا مرنا یہ سب خالص اللہ ہی
بذالک امرت وانا اوّل	کا ہے، جو مالک ہے سارے
المسلمین - (پ ۸ ع ۷)	جہان کا اس کا کوئی شریک نہیں
(ترجمہ مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ)	اور مجھ کو اسی کا حکم ہوا ہے اور میں

سب ماننے والوں سے پہلا ہوں۔

حق تعالیٰ ہمارے مقصود ہیں، اسی لئے ہمارے محبوب و مطلوب بھی۔

وَالذین آمنوا اشد	اور جو مومن ہیں ان کو اللہ کے ساتھ
حُبًّا لِلّٰہِ (پ ۲ ع ۴)	نہایت قوی محبت ہے۔

وہ ہماری جان و مال، فرزندوں سے زیادہ عزیز و محبوب ہیں۔

خواہم کہ ہمیشہ در ہوائے تو زیم خاکے شوم و بزیر پائے تو زیم
مقصود من خستہ ز کونین توئی از بہر تو میرم و برائے تو زیم

جب زندگی کا مقصود حق تعالیٰ ہیں، تواب دیکھو کہ وہ ہماری اس زمینی زندگی کو کس طرح بسر کرنے کا حکم دے رہے ہیں، پہلے اجمال پھر تفصیل۔

اجمالاً یوں سمجھو کہ جب حق تعالیٰ ہمارے معبود ہیں اور محبوب ہیں، تو ہمارا کام ایسا ہونا چاہیے کہ وہ کسی نہ کسی طرح عبادت میں شامل ہو جائے، یعنی ان ہی کے امتثالِ امر میں ہو، ان ہی رضامندی و خوشنودی کے خاطر ہو، نفس و ہوا کی پیروی میں نہ ہو یعنی لذت اندوزی کے

لیئے نہ ہو، عیش پرستی کے لیئے نہ ہو، جاہ طلبی کے لیئے نہ ہو، ہمارے قلوب پر مالکیت و حاکمیت اللہ کی ہو غیر اللہ کی نہ ہو، اور ہمارے ہر فعل کا تعین امر حق سے ہو، نفس و شیطان کے حکم سے نہ ہو، ایسی زندگی قرآن کی اصطلاح میں تقویٰ کی زندگی ہے اور یہی کامیاب زندگی ہے، اقبال کے تہدیدی الفاظ کا اس جگہ ذکر کرنا ضروری ہے، یہ اپنے الفاظ میں تقویٰ کی زندگی اور کامیاب زندگی کا خلاصہ پیش کر رہے ہیں،

واے ما اے وائے این دیر کہن
تیغ لا در کف نہ تو داری نہ من
دل ز غیر اللہ بہ پرداز اے جوان
این جہان کہنہ در باز اے جوان
تا کجا بے غیرت دین زیستن
اے مسلمان مردن است این زیستن
مرد حق بازآفریند خویش را
جز بہ نور حق نہ بیند خویش را
بر عیار مصطفٰی خود را زند
تا جہانے دیگرے پیدا کند

اب ذرا تفصیل میں جا کر تقویٰ کی ماہیّت کو اچھی طرح سمجھ لو، قرآن میں متقیوں کی تعریف اجمالاً یوں کی گئی ہے۔

والذي جاء بالصدق جو سچی بات لے کر آیا، اور

وصدق بہ اولٰئک ھم   جس نے اسکو سچ مانا، وہی لوگ
المتقون (پ ۲/ ع ۱)   پرہیزگار یا متقی ہیں۔

جو سچی بات لے کر آیا وہ نبی اور جس نے سچ مانا وہ مومن و متقی، تقویٰ نبی کو سچ ماننا اور اس کی تصدیق کرنی ہے، حق تعالیٰ انبیاء ہی کے ذریعہ علم صحیح عطا فرماتے ہیں، انبیاء اللہ ہی کے علم کو پیش کرتے ہیں، اپنی طرف سے اس میں کسی قسم کی نہ زیادتی کرتے ہیں اور نہ کمی، جو لوگ اس پر ایمان لاتے ہیں اور اس کے مطابق عمل کرتے ہیں، وہی متقی کہلاتے ہیں۔

تقویٰ کی کچھ تفصیلات کو اس آیت میں پیش کیا گیا ہے۔

لیس البر ان تولوا وجوھکم   کچھ سارا کمال اسی میں نہیں کہ تم اپنا
قبل المشرق والمغرب   منہ مشرق کو کر لو، یا مغرب کو لیکن
ولکن البر من امن باللہ   کمال تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ پر
والیوم الاخر والملٰئکۃ   یقین رکھے اور قیامت کے دن پر
والکتاب والنبیین واٰتی   اور فرشتوں پر، اور کتب پر اور
المال علیٰ حبہ ذوی القربیٰ   پیغمبروں پر، اور مال دیتا ہو اللہ کی
والیتٰمیٰ والمساکین وابن   محبت میں رشتہ داروں کو اور یتیموں کو
السبیل والسائلین وفی   اور محتاجوں کو، اور مسافروں کو اور
الرقاب واقام الصلٰوۃ   سوال کرنے والوں کو، اور گردن
واٰتی الزکٰوۃ والموفون   چھڑانے میں، اور نماز کی پابندی
بعھدھم اذا عاھدوا   رکھتا ہو، اور زکوٰۃ بھی ادا کرتا ہو،

والصابرین فی الباسآء والضرآء	اور جو اشخاص اپنے عہدوں کو پورا
وحین الباس اولئک الذین	کرنے والے ہوں، جب عہد کریں
صدقوا واولئک ہم المتقون	اور وہ لوگ مستقل رہنے والے ہوں
(پ ۲ ع ۶)	تنگ دستی میں اور بیماری میں اور
ترجمہ از مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ)	قتال میں یہ لوگ ہیں جو سچے ہیں اور

یہی لوگ ہیں جو متقی ہیں۔

اس آیۃ کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ تقویٰ کا انحصار چند عقائد، اعمال اور اخلاق پر ہے۔ عقائد میں اللہ پر، آخرت پر، ملائکہ پر، کتب منزلہ پر اور انبیاء علیہم السلام پر ایمان لانا داخل ہے۔ یہ تقویٰ کے اساس ہیں۔ عمل کا صدور ایمان و ایقان سے ہوتا ہے۔ متقی کے ایقانات جن کا نتیجہ اعمال صالح ہیں، یہ ہونے چاہئیں جن کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ اس کے بعد ان اعمال کی بھی کسی قدر تفصیل پیش کر دی گئی ہے۔ ان کی تین قسمیں کی گئی ہیں۔ انفاق اقامت صلوٰۃ و ایتائے زکوٰۃ۔ انفاق رشتہ داروں، یتیموں، محتاجوں مسافروں سوال کرنے والوں کے لیے ہو۔ اور قیدیوں کے چھڑانے میں کیا جائے۔ انفاق کی شرط مقدم حق تعالیٰ کی محبت ہے۔ یعنی جو کچھ خرچ کیا جا رہا ہے، وہ ان ہی کی محبت میں خرچ کیا جا رہا ہے۔ ان ہی کی خوشنودی و رضا کی خاطر۔ اس لیے نہیں کہ نام ہو، شہرت ہو، لوگوں کی نگاہوں میں برتری حاصل ہو۔ اخلاق میں ایفائے عہد اور صبر کا خصوصیت کے ساتھ ذکر ہے۔ تنگدستی میں، بیماری میں اور کفار کے ساتھ جنگ میں۔

تقوی کے متعلق دوسری تمام قرآنی تصریحات کو پیش نظر رکھ کر حضرت امام غزالیؒ اس کی جامع و مانع تعریف یوں کرتے ہیں کہ تقویٰ بچنا ہے ہر اس شے سے جس سے دین میں ضرر کا خوف ہو، محاورہ عرب سے بھی اس تعریف کی تائید ہوتی ہے، کیوں کہ جو بیمار پرہیز کرتا ہے اس کو عرب "متقی" کہتے ہیں، اس لئے کہ وہ ہر مضر چیز سے خواہ کھانے کی ہو یا پینے کی بچتا ہے[1] اس طرح دین کا تقویٰ نواہی سے اجتناب ہے، حضرت غزالی کی اس تعریف میں امتثال مامور یا عبادت پر زور نہیں دیا جارہا ہے، بلکہ صرف اجتناب محظور یا گناہوں سے پرہیز ہی کی تاکید کی جارہی ہے۔ منہاج العابدین میں وہ کسی جگہ فرماتے ہیں کہ عبادت کے دو بڑے حصے ہیں ایک عبادت کرنا، دوسرا پرہیز کرنا، اور یہ آدھا حصہ یعنی گناہوں اور شبہات سے پرہیز انسان کے لئے پہلے آدھے حصہ یعنی عبادت سے زیادہ بہتر ہے، بندہ عبادت کے حصہ پر زیادہ زور دیتا ہے، اور کامل اہل بصیرت پرہیز کا حصہ اختیار کرتے ہیں، اور ان کو ہر وقت یہ دھیان رہتا ہے، کہ دل کو غیر اللہ کی طرف مائل ہونے سے بچائیں، لیکن اگر دونوں حصے حاصل ہو جائیں یعنی عبادت و پرہیز تو کمال حاصل ہوتا ہے، اور سلامتی اور غنیمت میسر ہوتی ہے[2]

---

[1] دیکھو سراج السالکین ترجمہ منہاج العابدین ص ۷۵ (مطبوعہ نولکشور)

[2] دیکھو سراج السالکین ترجمہ منہاج العابدین ص ۱۱۸، ۱۱۹ ـــ

عبادت کے دونوں حصّوں کا خیال رکھ کر تقویٰ کی جامع و مانع تعریف اس طرح کی جا سکتی ہے "تقویٰ کفر و شرک نفاق و بدعت[1] سے احتراز امتثالِ اوامر، اجتناب محظورات اور رضا بمقدور ہے، متّقی کا قلب ایمان و توحید و صدق سے آراستہ ہوتا ہے سنّت پر قائم ہوتا ہے اور امر کا اتباع کرتا ہے، نواہی سے بچتا ہے، راضی برضائے حق رہتا ہے" اسی چیز کو حضرت غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانی رح اس طرح ادا فرماتے ہیں[2]
لا بد لکل مومن فی سائر احواله من ثلثة اشیاء امر یمتثله و نهی یجتنبه و قدر یرضی به، یعنی ہر مومن کے لئے تمام احوال میں تین

---

[1] احتراز کا ذریعہ لا الہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ ہے، ذات اللّٰہ ہی کو الٰہ قرار دینا یعنی معبود و مستعان ماننا زبان سے اقرار اور دل سے تصدیق کرنا توحید ہے، اس اقرار سے شرک کا خروج ہو جاتا ہے اور توحید داخل ہو جاتی ہے، جس ذات پاک نے یہ پیغام ہم تک پہنچایا، محمد صلی اللّٰہ علیہ وسلم ان کی رسالت کے اقرار سے دل سے کفر کا خروج ہو جاتا ہے اور ایمان جلوہ افروز ہوتا ہے، اس کا زبان سے اقرار اور دل سے انکار نفاق ہے، اس کی تصدیق کے بعد انکار ارتداد ہے، بدعت دین میں کسی نئی بات کا پیدا کرنا جو دین کی بات نہیں، اس کو دین سمجھنا ہے اجمالاً شرک کے جانے سے توحید، کفر کے جانے سے ایمان، نفاق کے جانے سے صدق، بدعت کے چھوڑنے سے سنّت حاصل ہوتی ہے (دیکھو باب اوّل، عبادت و استعانت)

[2] فتوح الغیب مقالہ اوّل۔

چیزیں ضروری ہیں، امر الٰہی بجالائے، نہی سے اجتناب کرے، اور تقدیر پر راضی رہے، اتنی بات یہاں سمجھ لینا ضروری ہے کہ امر الٰہی دو طرح پر ہوتا ہے، ایک تشریعی، یہاں وظیفۂ عبودیت یہ ہے کہ اس امر کو بجالائے، اور امر منفی کی صورت میں ممنوعات سے بچے، دوسرا تکوینی، یہاں بندگی کا وظیفہ یہ ہے کہ اس کو تسلیم کرے، رضا بالقضا کا اشارہ اسی طرف ہے، بالفاظ دیگر جو حق تعالیٰ کہیں وہ کرے، اور جس طرح وہ رکھیں اس طرح رہے اوّل عبادت ہے اور ثانی عُبودیت" ایسی ہی زندگی تعلّی کی زندگی ہے۔ اور ہر معنیٰ میں کامیاب زندگی!

اب دیکھو زندگی میں کامیابی و سرخ روئی کے لئے کن صفات کی ضرورت ہے، جو متّقی کی سیرت کا جزو نہیں، وہ حق تعالیٰ پر شدّت سے ایمان رکھتا ہے، ان سے شدّت سے محبت کرتا ہے کو وہ خیر مطلق اور قدّوس مانتا ہے، زندگی اور کائنات کا مبدء وہ حق تعالیٰ ہی کو جانتا ہے اور لازمًا زندگی کو بھی خیر سمجھتا ہے، جب اس کے اعتقاد و اذعان کی رو سے زندگی اچھی اور زندگی کے تجّربات اچھّے ہیں تو پھر وہ ان سے زندہ دلی اور جوش کے ساتھ تعاون عمل کرتا ہے، قنوطیت و یاس کا اثر اس کے قلب پر مطلق نہیں ہوتا، اس کی زندگی اور خارجی حالات میں توافق پیدا ہو جاتا ہے، اس کو شادمانی و کامیابی نصیب ہوتی ہے۔

عارف رومی نے کہا تھا انما التدبیر بتبدیل المزاج [1] ۔۔ آدمی

---

[1] تدبیر اس کے سوا کچھ اور نہیں کہ مزاج ہی بدل جائے۔

میں سب سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ عملی چیز کائنات کے متعلق اس کا نقطۂ نظر ہے[۱]، مومن کا کائنات کے متعلق نقطۂ نظر تم نے اوپر دیکھا کہ کیا ہے، اس کے نزدیک کائنات ایک قدوس و قادر و علیم مطلق ذات کی تجلیات کا مظہر ہے، اسی یقین کی وجہ سے وہ زندگی میں کامیاب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، اپنے مزاج کی اسی خوشگوار تبدیلی کی وجہ سے وہ جہاں کے ناموافق عناصر کو اپنے موافق بنا لیتا ہے، چار سوئے کائنات اس کو بدلے ہوئے نظر آتے ہیں، اقبالؔ کے اس گمان کو صحیح کر دکھاتا ہے ؎

تری خودی میں اگر انقلاب ہو پیدا
عجب نہیں ہے کہ یہ چار سو بدل جائے

خالقِ کائنات و ربّ کائنات سے حسن ظن رکھنے کی وجہ سے کائنات بھی اس کے ارادے کے مطابق بن جاتی ہے۔ اور انا عند ظن عبدی بی کی بشارت صحیح ہوتی ہے، وہ حق تعالےٰ سے راضی ہوتا ہے تو حق تعالیٰ اس سے راضی ہوتے ہیں، رضی اللّٰہ عنہم و رضوا عنہ کا قول سچا ہوتا ہے، صادق مصدوقؐ نے بھی تو اس کی خبر دی تھی، ان للّٰہ رجالاً یرضی برضاھم و یغضب بغضبھم کما انھم یرضوا برضائہ و یغضبوا بغضبہ، بعض رجال اللّٰہ ایسے بھی ہیں جن کی رضا سے حق تعالیٰ بھی راضی ہوتے ہیں اور جن کے غصّہ سے وہ بھی غضب فرماتے ہیں، جس طرح کہ

---

[۱] یہ جی، کے رچیسٹرٹن کا مقولہ ہے جو انگلستان کا ایک مشہور ادیب گزرا ہے۔

یہ مردانِ حق اپنے مولیٰ کی رضا سے راضی اور اس کی ناراضی سے خود بھی ناخوش ہوتے ہیں، متقی کی اسی شان کو دیکھ کر کسی عارف کے اس قول کی تصدیق ہوتی ہے ؎

فارغ نشیں و غم مخور و شاد زی
ایں معنی لا الٰہ الا اللہ است!

مومن متقی کے خمیر میں وہ سب عناصر موجود ہوتے ہیں جن کی وجہ سے وہ ایک حقیقی معنیٰ میں کامیاب زندگی بسر کرتا ہے انہی کا خیال رکھ کر امام غزالی فرماتے ہیں کہ "جس نے تقویٰ اختیار کیا، اس کے سارے ترددات رفع ہو گئے، اب وہ آرام سے جدھر چاہے سو رہے ایات اصل متی سو حاصل ہو گئی، اپنی تائید میں وہ قتادہؓ کا یہ قول نقل فرماتے ہیں کہ توریت میں لکھا ہے کہ "اے فرزندِ آدم تقویٰ اختیار کر اور جدھر چاہے سو رہ" مومن متقی مجاہد ہوتا ہے، سو نہیں رہتا، مطلب یہ ہے کہ اس کو اپنی ناکامیابی کا اندیشہ نہیں، بالفاظ غوث اعظمؒ ساکن الجوارح، مطمئن الجنان، مشروح الصدر، منور الوجہ، عامر الباطن، غنی عن الاشیاء بخالقہا[1] ہوتا ہے، لوگ اشیاء کی ملکیت کی وجہ سے خود کو غنی سمجھتے ہیں، وہ غنی بالشئے ہوتے ہیں، مجاہد متقی اشیاء سے بے نیاز ہوتا ہے

---

[1] ساکن الجوارح (بلا حرکت اعضاء) اور قلب مطمئن اور فراخ و کشادہ سینہ، روشن چہرہ، باطن آباد اور تعلق خالق کی وجہ سے تمام چیزوں سے بے پروا۔ (فتوح الغیب مقالہ ۶)

وہ خود خالق اشیاء کو رکھتا ہے، اس لئے وہ غنی عن الشئی ہوتا ہے اس کے ذل وافتقار کی نسبت حق تعالیٰ سے ہے، وہ حق تعالیٰ کا فقیر ہے، اشیاء سے غنی ہے، اس کے ہاتھ میں لا الہ الا اللہ کی شمشیر ہے اسی لئے وہ فرمانروائے موجودات[1] ہے اس فقیری ہی کی وجہ سے اس کو امانت ملی اور اس امانت کی وجہ سے خلافت عطا ہوئی اب وہ خلیفۃ اللہ ہے اسی لئے

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کار کشا کارساز

(اقبال)

تم دنیوی نقطۂ نظر سے کامیاب زندگی کس قسم کی زندگی کو قرار دیتے ہو؛ وہی نہ جو آسمان و زمین کے برکات سے مالا مال ہو؛ دیکھو اس کا حصول ایمان و تقویٰ پر منحصر ہے،

ولو ان اھل القریٰ	اگر ان بستیوں کے رہنے والے
امنوا واتقوا لفتحنا علیھم	ایمان لے آتے اور پرہیز کرتے
برکات من السماء والارض	تو ہم پر آسمان اور زمین کی برکتیں
(پ ۹ ع ۲)	کھول دیتے

ان برکات کے ساتھ پھر نہ رنج نہ تعب ہوگا، نہ حزن و خوف۔

---

[1] ہر کہ اندر دست او شمشیر لاست جملہ موجودات را فرماں رواست
(اقبال؟)

فَمَنِ اتَّقٰی وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (پ ۸ ع ۱۱)

پس جو شخص تقویٰ اختیار کرے اور درستی کرے سو ان لوگوں پر نہ کچھ خوف ہے اور نہ حزن۔

کامیاب زندگی وہی ہے جس میں دشمنوں سے محفوظیت حاصل ہے، بشرط تقویٰ اس کا وعدہ کیا جا رہا ہے۔

ان تصبروا و تتقوا لا یضرکم کیدھم شیئًا۔ (پ ۴ ع ۳)

یعنی تم استقلال اور تقویٰ کے ساتھ رہو تو ان لوگوں کی تدبیر تم کو ذرا بھی ضرر نہ پہنچا سکے گی۔

حق تعالیٰ کی معیت اور اعانت کی وجہ سے متقی غالب و منصور ہوتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِیْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ۔ (پ ۱۴ ع ۲۲)

اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو متقی ہوتے ہیں اور نیک کردار ہوتے ہیں۔

کامیاب زندگی وہ ہے جس میں سختیوں سے نجات ہو، رزق حلال ہو، دیکھو اسی کا تو وعدہ متقیوں سے کیا گیا ہے، وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّیَرْزُقْهُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ۔ متقی کی نجات کی شکل حق تعالیٰ نکال دیتے ہیں اور اس کو ایسی جگہ سے رزق دیتے ہیں، جہاں اس کا گمان بھی نہیں ہوتا (پ ۲۸ ع ۱۷) اس کے ہر کام کو آسان کر دیتے ہیں،

وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ یُسْرًا (پ ۸ ع ۱۱)

اخروی نقطۂ نظر سے بھی متقیوں ہی کی زندگی کامیاب ہوتی ہے،

کیوں کہ وہ حق تعالیٰ کے محبوب ہوتے ہیں اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ ان ہی کی عبادت قبول ہوتی ہے۔

اِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللّٰہُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ۔	حق تعالیٰ متقیوں ہی کا عمل قبول کرتے ہیں۔

ان ہی کو حق تعالیٰ کے نزدیک بزرگی حاصل ہے۔

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ۔	اللہ کے نزدیک سب سے بڑا شریف وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی یا پرہیزگار ہو۔
(پ ۲۶ ع ۱۴)	

ان ہی کے اعمال قبول ہوتے ہیں، اور گناہ معاف ہوتے ہیں۔

یا ایھا الذین امنوا اتقوا	اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور
اللہ وقولوا قولا سدیدًا	راستی کی بات کہو اللہ تعالیٰ
یصلح لکم اعمالکم وَ	تمہارے اعمال کو قبول کرے گا
یغفر لکم ذنوبکم۔	اور تمہارے گناہ معاف کردیگا

دوزخ کی آگ سے ان ہی کو نجات ملتی ہے۔

وینجی اللہ الذین اتقوا	اور جو لوگ متقی ہیں حق تعالیٰ ان کو
بمفازتھم لا یمسّھم	کامیابی کے ساتھ نجات دیں گے
السوء ولا ھم یحزنون۔	ان کو نہ تکلیف پہنچے گی اور نہ وہ
(پ ۲۴ ع ۳)	غمگین ہوں گے۔

• ان ہی کے لئے بالآخر جنّت ہے اور سامان عیش و عشرت۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِىْ جَنّٰتٍ وَّنَعِيْمٍ (پ ۲۷ ع ۲) متقی لوگ بلاشبہ باغوں اور ساماں عیش میں ہونگے ۔

بہرحال مومن متقی کے لئے دونوں جہاں کی خوشخبری ہے، دنیا کی خوشخبری آرام و آسائش اور برکتیں، غم و خوف و حزن سے نجات ، دشمنوں سے حفاظت اور حق تعالیٰ کی معیت و نصرت اور آخرت کی بشارت معاملۂ قبر، حساب و کتاب کا آسان ہونا، یعنی حبس و حساب قیامت سے رستگاری اور بخشش خداوند غفار و ستار، پھر روح و ریحان و جنات نعیم [1]

الا ان اولیاء اللّٰہ	یاد رکھو کہ اللہ کے دوستوں پر
لا خوف علیھم ولا ھم	نہ کوئی اندیشہ ہے اور نہ وہ
یحزنون ۔ الذین امنوا	مغموم ہوتے ہیں، یہ وہ ہیں جو
وکانوا یتقون لھم البشری	ایمان لائے اور تقویٰ اختیار
فی الحیوۃ الدنیاء و فی	کرتے ہیں ان کے لئے دنیوی
الاخرۃ لاتبدیل لکلمات اللّٰہ	زندگی میں بھی اور آخرت
ذالک الفوز العظیم (پ ۱۱ ع ۱۲)	میں بھی خوشخبری ہے ۔

دیکھو! یہی راز ہے جس کو پا لینے کے بعد تمہاری سمجھ میں آجائے گا کہ کیوں حق تعالیٰ جو ہمارے مولیٰ ہیں، اور سب سے زیادہ خیرخواہ، سب اگلے پچھلوں کو ایک ہی وصیت فرماتے ہیں، اور وہ یہی ہے کہ ہم تقویٰ کی زندگی

---

[1] راحت اور غذائیں ہیں اور آرام کی جنت (سورۂ واقعہ)

اختیار کریں اور ابس، بتاؤ تم زیادہ جانتے ہو کہ اللہ انتم اعلم ام اللہ ؟
وصیّت ان الفاظ میں ہوئی ہے، وَلَقَدْ وَصَّیْنَا الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتَابَ مِنْ قَبْلِکُمْ وَاِیَّاکُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰہَ (پ ۵ ع ۱۷) واقعی ہم نے ان لوگوں کو بھی حکم دیا تھا جن کو تم سے پہلے کتاب ملی تھی اور تم کو بھی کہ تقویٰ اختیار کرو۔
مومن کی خصلت تقویٰ ہے اور یہ خصلت دنیا و آخرت دونوں کی جامع ہے، اور سب کاموں کے لیئے کافی!
مومن جانتا ہے کہ ع

عقل کو تنقید سے فرصت نہیں

اسی لیئے وہ عشق و ایمان پر اعمال کی بنیاد رکھتا ہے، اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ، حق تعالیٰ کی تقویٰ سے متعلق یہ وصیّت ہمیں مصطفیٰ صلّی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے پہنچی ہے، ان کی بات کا انکار کفر ان کی بات میں شبہہ نفاق، ان کی بات میں اپنی بات کا ملانا بدعت ہے اور ان کی بات کا جوں کا توں مان لینا ایمان ہے، اس لیئے گو

تعلیم پیر فلسفۂ مغربی ہے یہ
ناداں ہیں جن کو ہستیٔ غائب کی ہے تلاش
پیکر اگر نظر سے نہ ہو آشنا تو کیا
ہے شیخ بھی مثال برہمن صنم تراش
محسوس پر بنا ہے علوم جدید کی
اس دور میں ہے شیشہ عقائد کا پاش پاش

مذہب ہے جس کا نام وہ ہے اک جنونِ خام
ہے جس سے آدمی کے تخیّل کو ارتعاش
کہتا مگر ہے فلسفۂ زندگی کچھ اور
مجھ پر کیا یہ مرشدِ کامل نے راز فاش
با ہر کمال اندکے آشفتگی خوش است
ہر چند عقلِ کل شدۂ بے جنوں مباش

(اقبالؒ)

آیئے اسی جنون یا عشق کی اپنے مولا سے التجا کریں۔

عطا اسلاف کا جذبِ دروں کر — شریکِ زمرۂ لایحزنوں کر
خرد کی گتھیاں سلجھا چکا ہوں — مرے مولا مجھے صاحبِ جنوں کر

(اقبالؒ)

(نذر حسین عاقل گوجرانوالہ)

(سید رئیس احمد جعفری ندوی) کے قلم سے اچھوتی کتاب

نیا تذکرۃ الاولیاء

انسانی سیرت کی تعمیر کا ممد و معاون

عرصۂ دراز سے بزرگان دین اور صوفیائے کرام کے حالات و واقعات تذکروں کی شکل میں شائع ہوتے رہے اور آج بھی موجود ہیں۔ لیکن آج جبکہ زمانے کے ساتھ ساتھ رجحانات میں ایک شدید انقلابی کیفیت و ماہیت پیدا ہو گئی تو ضروری ہو گیا کہ ان تمام عدیم المثال تبدیلیوں کے پیش نظر ایک تذکرہ از سر نو ترتیب دیا جائے۔ الحمد للہ کہ یہ دشوار مہم جناب سید رئیس احمد صاحب جعفری ندوی کی سعی و کوشش سے سرانجام پائی اور ایک "نیا تذکرۃ الاولیاء" پیش کرنے کا فخر فرم ہذا کو حاصل ہوا۔

اس کتاب کی ترتیب میں بہت سی ضروری باتوں کا خاص خیال رکھا گیا ہے جس میں سے چند حسب ذیل ہیں اور یہی باتیں اس تذکرے کی خصوصیات ہیں مثلاً

- حضرت فریدالدین عطار کا تذکرۃ الاولیاء صرف پیش نظر نہیں رکھا گیا بلکہ اس کے مندرجات بہ ترتیب حروف تہجی سے منظم کیا ہے اور اس کی تعقید و طویل عبارت کو سہل اور مختصر کر دیا گیا ہے۔ زندگی پر موثر طریقہ سے اثر انداز ہونے والے کردار اور سیرت کے واقعات کو زیادہ اجاگر کر کے بیان کیا گیا ہے۔
- بہت سے بزرگوں اور صوفیوں کے حالات جو کسی ایک کتاب میں یکجا نہیں ملتے اس کتاب میں بسط و تفصیل سے درج کئے گئے ہیں
- اس کے دوسرے حصہ میں پاکستان اور ہندوستان وغیرہ کے مشہور صوفیائے عظام کے حالات و واقعات نہایت تحقیق و جستجو سے فراہم کئے گئے ہیں۔
- نام تلاش کرنے کی دشواری اور تقدیم و تاخیر کے پیش نظر تذکرہ کی ترتیب بلحاظ حروف تہجی کی گئی ہے
- تاریخ تصوف پر ایک مستقل باب لکھ کر کتاب کے ابتدا میں شامل کیا گیا ہے۔

بڑا سائز $\frac{20 \times 30}{8}$ ضخامت ۷۶۰ صفحات۔ مجلد قیمت سات روپے

شیخ غلام علی اینڈ سنز کتاب منزل لاہور

-:RULES:-

1. The book must be returned on the date stamped above.
2. A fine of Re. 1/- per volume per day shall be charged for textbooks and 10 P. per vol. per day for general books kept overdue.